دی میں مشکل سے موضوع پر ناول؟
ں ملکوں کے رسائل میں باقاعدگی سے شائع ہ
دی کے لیے ڈرامے بھی لکھتے ہیں اور دُور درشن جا
یر دگرام بھی پیش کرتے ہیں اس کی وجہ سے بھی ان
کے لیے جانا پہچانا ہے ان کے پاکستان کے ادیبوں
یراں کے ساتھ بھی گہرے ودانی روابط قائم ہیں اور وہ
کی مایر وہ چند ہفتوں کے لیے پاکستان گئے تھے جہاں
وں ساعروں، صحافیوں اور اُردو کے ناشروں سے ملاقا
ے شمار دعوتوں میں شرکت کی انھیں ایسی کہاساں سُ
لھا ماں سُنیں اُن کو اپنے یہاں کے ادیبوں کا احوال کہنے
ں کے بھی ادبی مباحثے تھے اوران سب ملاقاتوں کی ایک
معیاری روئیداد لکھ دی ہے جس نے انھیں ایک اچھے انسا
اچھا سفرنامہ نگار بھی ثابت کردیا ہے
ڈاکٹر ذھیر کے اس سفرنامے میں لاہور کے تاریخی حالات وا
سیاسی نظام و جامع آدمی کی زندگی، نئے لاہور کی وہ تصویریں جو گھ
مرترقی سے عبارت ہیں اور وہاں کے سے مور پرانے ادیبوں اور دانشو
ران کے ادبی تعلیقات کا ذکر اتنی تفصیل سے موجود ہے اور اس ذکا
دل تعمیر کی ترف نگاہی اوران کا بے پناہ خلوص بھی اس انہ
ہر اس کا مطالعہ کرتے وقت مجھے بارہا یہ احساس ہوا کہ میں حم
ام کے محنت کی چھلیں اٹھاتیں ہانستے ہوئے دریا میں ایک
ا سا ہوں اور اس میں سیاست کا کوئی جان لیوا تصور نہ
مرتیت کا کوئی فکر بھی نہیں ہے جو پڑھنے والوں کو اکثرا
رتبہ میں لے جایا کرتا ہے یہ سفرنامہ خوشنو محض خوشنو ہے
ہی فضا ہے جس میں سانس لینے سے روح پاکیزہ اور
وجاتے ہیں

—

D

خوشبو کا سفر

سفرنامہ پاکستان

खुशबू का सफ़र

By

केवल धीर - 60=6

D

ڈاکٹر کیول دھیر

ڈاکٹر کیول دھیر کی دیگر مطبوعات

مطبوعہ

- بکھری ہوئی زندگی (افسانوی مجموعہ)
- ایا دامن اپنی آگ (افسانوی مجموعہ)
- ستو میرا دوست
- اُردو، انگریزی، ہندی اور پنجابی میں پچاس سے زائد دیگر کتابیں

زیرِ طبع

- گوری کے دیش میں (سفرنامہ کینیڈا، امریکہ اور برطانیہ)
- پنجاب کے اُردو نثر نگار

یہ کتاب بھاشا وبھاگ، پنجاب کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

خوشبو کا سفر

سفرنامۂ پاکستان

ڈاکٹر کیول دھیر



موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ ۱۱

۲ حیمہ پارک، ماڈل گرام
لدھیانہ (پنجاب۔ بھارت)

پہلی بار ستمبر ۱۹۸۸ء
قیمت ساٹھ روپے 60/
کتابت محمد عمران اعظمی
سرورق رزاں ارشد
طباعت اے ون آفسیٹ پرنٹرز دہلی



زیرِ اہتمام
پریم گوپال مِتّل

رابطہ
موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲



خوشبو کے سفیر

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

اور

کُشترَی اَرحلس

کے نام۔

اظہار

"خوشبو کا سفر" سترہ جنوری ۱۹۸۶ء تا تیس جنوری ۱۹۸۶ء

پاکستان کی یاترا کے یہ سولہ دن میری ادبی زندگی کے خوبصورت ترین دن ہیں جنہوں نے مجھے محبتوں اور دوستیوں کی بے پناہ دولت سے مالا مال کر دیا ۔ اپنے جنم کی دھرتی کی مقدس مٹی کی مہک میرے وجود میں رچ بس گئی ایک جذباتی تسکین حاصل ہوئی ـــــ ایک تازگی ملی اور میرے قلم کو ایک نئی طاقت، ایک نیا جنون میسر ہوا۔ یہ محض سفر ہی نہیں میرے لیے ایک ایسا تخلیقی تجربہ تھا جس کے ساتھ شعوری اور غیر شعوری طور پر جذبات وابستہ تھے ـــــ دھڑکنیں شریک تھیں۔

جذبوں اور دھڑکنوں کی اس حقیقی داستان کو اسی لیے میں نے "خوشبو کا سفر" نام دیا ہے ـــــ اور یہ داستان دلی خلوص محبت اور احترام کے ساتھ آپ کی نذر ہے ۔

بگولوں کی صورت یہاں پھر رہے تھے
ترے شہر میں اک جہاں چھوڑ آئے
یہ اعجاز ہے حسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے (حسب حال)

ڈاکٹر کیول دھیر

دیباچہ

ڈاکٹر کیولؔ دھیر پاکستان کے ضلع ساہیوال کے ایک قصبہ گگو میں پیدا
ہوئے تھے گگو یہامی میں ایک موجی سی صدا مد ترکیب سے عبارت ہے ——
انگلیاں باندھ کر ہتھیلیوں کے درمیاں خلا میں ایک شد اور کھلنڈری سانسیں
بھر بھر کے بس ایی ان مترنم صداؤں پر ناچنا شروع کر دو —— اس
شعرپارے میں کیول دھیر نے بھی دراصل اسی ماندایی محنت اور موج کی صلاہدی
کی ہے اور ایسا کرتے ہوئے ایی ترنگ کو قارئین میں منتقل کر پایا ہے۔
"جوستو کا سفر" پر ایک بار جھک کریں آخری سطر تک ایسا سرائو پر یہ
اُٹھایا یا۔ بہت سے مُصنفین اِس نوعیت کی کتابوں میں ایی تحریر کو خواہ مخواہ
پیچیدہ سا ڈالتے ہیں اور دانشوری کے ثبوت فراہم کر لینے کے باوجود
بے چارے ایک قابلِ مُطالعہ نہیں ہو پاتے۔ خدا کا شکر ہے کہ کیول دھیر کی
یہ تصنیف اُن کی کہانیوں ہی کے مانند بڑی سادہ اور جاذب اور اسی لیے

نہایت قابلِ مُطالعہ ہے۔ ایسی بے تحفظ سادگی سے واسطہ بڑے پر آدمی
اپنے ہتھیاروں کو ایک طرف ڈال کر گویا لکھنے والے سے عین فطری طور پر
گھُل مِل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کنول دھیر سے کبھی راست مُلاقات نہ
ہونے کے باوصف مجھے وہ اپنے کوئی دیرینہ رفیق معلوم ہوتے ہیں۔

اگرچہ "خوشبو کا سفر" کے ذریعے ڈاکٹر دھیر نے ہمیں موجودہ
پاکستانی زندگی کے تعلق سے کئی اہم اطّلاعات بھی بہم پہنچائی ہیں۔ تاہم
اس سفرنامے کے اوّلین انتساب میں یہ امر پیش ہے کہ وہ ہمیں اپنی
محبّت کی وارداتوں میں شریک کرنے سے کہیں چوک نہ جائیں۔ انھی
وارداتوں کی بدولت ان کے بیانیوں میں نیک جذبوں کی حدّت
اور بعض نہایت پیارے رنگ بھر آئے ہیں۔ اِس ضمن میں یہ بات
خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ جب انھوں نے اس سفر کا قصد کیا تو ان
کے پاس کوئی ایک بھی ایسا پاکستانی پتہ نہ تھا جہاں انھیں اپنے قیام کی
سہولتوں کا یقین ہوتا، لیکن ان کے سفرنامے کے درمیانی صفحوں پر
پہنچتے پہنچتے احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ جہاں بھی جا پہنچیں گے ان کے مہربان
انھیں سر ہاتھوں پر بٹھا لیں گے۔ اس میں ان کے میزبانوں کی وسیع القلبی
تو کارفرما ہے ہی، مگر اس طلسم کی اصل کارفرمائی ان کی محبّت کی توفیق کی بھی
دین ہے۔ ان کی محبّت کرنے اور محبّت کیے جانے کی خواہش کتاب میں جا بجا
ہمیں ایسے مقامات پر لے آتی ہے جہاں گرم جوش انسانی تعلّقات
کی برتری میں ہمارا یقین بحال ہونے لگتا ہے۔ کیول دھیر کی اس کتاب
کو پڑھ کر ذہن میں بے اختیار یہ سوال ابھرتا ہے۔ اور یہ نہایت اہم سوال
ہمارے دونوں ملکوں کے سربراہوں کی خصوصی توجّہ کا متقاضی ہے ـــــــ

کرحسٹ دونوں بڑوسی ملکوں کے عوام کی آپسی چاہ کے اسباب اتنے فطری اور خودکار ہوں تو پھر اجتماعی اور سرکاری سطحوں پر دونوں جوانب تامل کی گنجائش کیوں کر روا رکھتی ہیں؟

ڈاکٹر دھیر کا یہ مشاہدہ نہایت مناسب ہے کہ قلم کے رشتے بہت گہرے ہوتے ہیں۔ اس مناسبت سے کیا یہ لازم نہیں ہوجاتا کہ دونوں ملکوں کے ویزا کی سہولتوں کے باب میں ان رشتوں کو پیش نظر رکھا جائے؟ اردو کا ایک ادیب ہونے کے ناطے میں بخوبی سمجھ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر دھیر ایسے پاکستانی ہم قلموں سے باہم رابطہ بنائے رکھنے کے لیے بے تاب کیوں ہیں۔ ایک ہی زماں کے معاصرین ایک دوسرے سے دور دور رہتے ہونے کے باوجود دراصل ایک دوسرے کے دلوں میں بسے ہوتے ہیں۔ بہرحال کیول دھیر کی یک ساں یاترا سے صرف ان کی متاثر آتی ملکہ ان کی رفاقت میں ایسے کئی محترم قلم کاروں سے ہماری ملاقات کی بھی تدبیر ہوئی بعض نقادوں کا خیال ہے کہ ادباء سے ہماری اصل ملاقات تو ان کے ادب میں ہی ہو لیتی ہے مگر یہ بھی غلط نہیں کہ ادباء سے ان کی روزمرہ کی زندگی میں گوشت پوست میں مل پانے سے ایک تو ہمارے فطری تجسس کے متعدد تقاضے پورے ہوجاتے ہیں، دوسرے ہمیں ان کی مستقبل کی تخلیقات کی بھی آہٹ سی ہوجاتی ہے۔ خوش قسمتی سے کاسفر کے تاثر میں کی خوش قسمتی سے کہ ڈاکٹر دھیر کی ادبی ملاقاتیں بھرپور رہی ہیں اور انہوں نے ایسے بیان میں کہیں بھی التزام سے کام نہیں لیا، بلکہ بڑی دیانت اور سادگی سے اپنی گٹھڑی کھول دی ہے۔ ارباب دانش شاید اس نے تحفظ راست بیانی کو سخرہ بن پر محمول کر کے اپنی انا کی تسکین کریں مگر تاریخ گواہ ہے کہ تیا پانچ

کی نقابیں سیدا اسی ڈھب کا سفرنامہ یہ انسان کے آڑے آیا ہے۔

مسز رحمٰن لاہور میں کیول دھیر کی میزبان تھیں۔ ایک "اجنبی" ملک میں کسی کو اس نیک اور معزز خاتون کے مانند میزبان مل جائے تو بھائی کو دنیا بھر کی نعمتیں میسر آجاتی ہیں۔ ڈاکٹر دھیر واقعی بڑے خوش نصیب ہیں۔

میری رائے ہے کہ "خوشبو کا سفر" جیسی کتابوں کا یہ تشکیل اور ہمدردانہ تاثر بھی ہمیں اسی طرح رادیکیوں اور محبتوں کا اہل بناتا ہے۔

جوگندر پال

۱۸ جولائی ۱۹۸۸ء

۴۳، منداکنی انکلیو،

نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

تیرا دیش — میرا دیش

پاکستان جانے کی خواہش بہت برسوں سے دل میں مچل رہی تھی اس کی بہت سی وجوہات تھیں جن کا تعلق ادب اور جذبات دونوں سے تھا۔

ادب کی وجہ صرف اتنی سی ہے کہ میں کہانیاں لکھتا ہوں اور اس زبان میں لکھتا ہوں جو یہاں اور وہاں کے درمیان ایک اشتراک کی بنیاد ہی نہیں بلکہ ایک رشتے کو بھی جنم دیتی ہے یہ رشتہ قلم کا ہے اسی رشتے سے پہچان ملتی ہے۔ اسی رشتے سے محبت اور خلوص پیدا ہوتا ہے اسی رشتے سے دوریاں مٹ کر نزدیکیاں پیدا ہوتی ہیں یہ ایک ایسا رشتہ ہے جس میں مذہب یا سیاست کو کوئی دخل حاصل نہیں ادب کا رشتہ بہت مضبوط اور بہت عظیم ہے ———— اور ادب کے اس رشتے کا نام ہے اردو زبان

اردو بھارت کی ایک طاقتور اور مقبول زبان ہے اور یہ پاکستان کی قومی زبان ہے بھارت کے مقبول قلم کاروں کی نمائندہ تحریریں پاکستان کے رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتی ہیں اور اسی طرح پاکستان کے ادیبوں کی تخلیقات بھارت میں شائع ہوتی ہیں جو لوگ یہاں اور وہاں چھپتے ہیں اور جنہیں دونوں ملکوں کے قارئین باقاعدگی سے پڑھتے ہیں، اُن میں ایک نام میرا بھی ہے ادب کے ناطے سے میرا ایک جذباتی رشتہ ہے اُن قارئین اور قلم کار دوستوں سے ہے جو سرزمین پاکستان کے باسی ہیں اور جو مجھے اکثر لکھتے رہتے ہیں کہ میں پاکستان آؤں۔

پاکستان جانے کی خواہش کی جذباتی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ میرا جنم ضلع ساہیوال کے

ایک قصبے گنگوہ میں ہوا تھا جہاں میرے والد سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹر تھے۔ جنم بھومی کی مٹی کے رشتے سے
انسان کبھی اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکتا یہ رشتہ بہت ہی نازک اور جذباتی ہوتا ہے اُس دھرتی کی مٹی
میں ایک عجیب سی کشش ـــــ ایک عجیب سی خوشبو ہوتی ہے جو ہمیشہ جذبوں کی شدت میں اضافہ
کرتی ہے جس دھرتی پر میں پیدا ہوا تھا ـــــ اور جس دھرتی پر میرا معصوم بچپن پروان چڑھا تھا
اُس دھرتی کی مہک سے معطر میری خواہش برابر مچلتی رہی تھی۔

اپنی جذباتی خواہش کی تکمیل کے لیے میں نے کئی بار کوشش کی اور پاکستان جانے کے لیے ویزا حاصل
کرنے کی غرض سے کئی بار دہلی میں پاکستانی سفارت خانے سے رابطہ قائم کیا لیکن مجھے ہر بار ناامیدی
ہوئی ہر بار مجھ سے پوچھا گیا کہ پاکستان میں آپ کے کون سے رشتے دار ہیں ـــــ اور ہر بار میں نے
کہا کہ وہاں کے قلم کاروں سے، اپنے قارئین سے اور اپنی جنم کی دھرتی سے میرا جذباتی رشتہ ہے لیکن ویزا حاصل
کرنے کی شرائط کے تحت شاید یہ رشتہ نہیں آتا تھا اور اس رشتے کو کبھی تسلیم بھی نہیں کیا گیا۔

حالات کی یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ادھر اور اُدھر کی ساری دھرتی بھی ایک دیش تھی یہاں اور
وہاں کے لوگوں کی زبان، رہن سہن، رسم و رواج، سماجی قدریں اور کلچر مشترک تھا۔ تب ہم سب ایک
تھے اور برطانوی سامراج ہم پر حکومت کر رہا تھا لگاتار برسوں تک ہم سب مل کر انگریز سرکار کی غلامی
کی زنجیروں سے آزاد ہونے کی لڑائی لڑ رہے تھے ۱۹۴۷ء میں ہمیں آزادی ملی ـــــ لیکن
دیش کے بٹوارے کے ساتھ، دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوئے دیش کے ایک حصّے کو پاکستان کا نام ملا۔ ایک
دیش ٹوٹا اور ایک نیا دیش وجود میں آگیا بات محض اتنی سی ہوتی تو یہ کوئی خاص بات نہیں ہوتی خاص بات
یہ ہوئی کہ انگریزی حکومت نے اپنی سیاسی چالوں سے یہ بٹوارا کچھ اس طرح کیا کہ انسان کے دلوں میں نفرت
اور تعصب کے جذبات بھڑکا کر اسے فرقوں میں بانٹ دیا ایسی تقسیم کبھی خوش گوار نہیں ہوتی ـــــ اور
یہی سب کچھ ہوا جذبے مجروح ہو گئے نفرت کی آندھیاں چلنے لگیں تعصب کی آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔
فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے اور اس خونی کھیل میں نہ جانے کتنی معصوم زندگیاں قتل ہو گئیں ـــــ
کتنے بچے یتیم ہو گئے ـــــ کتنی دلہنوں کے سہاگ اُجڑ گئے ـــــ اور کتنے ہی گھر جل کر
راکھ ہو گئے اپنی دھرتی کو کھو کر اپنی دھرتی کی تلاش میں لاتعداد خاندان مہاجر بن گئے ایسے خاندانوں
کی تعداد بھی کم نہیں تھی جو ملکی تقسیم کے ساتھ ساتھ خاندانی تقسیم کا نشانہ بنے ہوئے کسی کا بھائی اُس طرف

بس گیا اور کسی کی بہن اس طرف ——— ماں باپ اور بھائی بھتیجے بھی بٹ گئے۔ دونوں طرف خاندانی اور سماجی رشتے قائم رہتے ہوئے بھی یہ رشتے تقسیم ہو گئے

ہندوستان نے اس تقسیم اور پاکستان کے وجود کو تسلیم کیا ——— لیکن ان تمام انسانی رشتوں، مشترکہ کلچر اور زبان کے باوجود دونوں ملکوں میں کبھی خوش گوار تعلقات قائم نہیں ہو سکے۔ اس کی متعدد سیاسی وجوہات ہیں جن کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ صرف اتنا ہی ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ ملکی تقسیم ہوئے چار دہائی ہونے کو ہیں اور دونوں ملکوں کے درمیان سیاسی سطح پر ہمیشہ تناؤ قائم رہا ہے شاید اس کی بڑی وجہ دونوں ممالک کی اپنی اپنی مصلحت بینی یعنی خارجہ پالیسی ہے اور اسی کے سبب دونوں ملکوں کے کروڑوں عوام کو غریبی اور بے چارگی کا درد سہنا پڑا ہے ——— خوش حالی کی رفتار مدھم ہوئی ہے ——— تعلقات تلخ بھی ہوتے رہے ہیں لیکن اس سب کے باوجود جن جذباتی رشتوں کا ذکر میں نے کیا ہے، وہ رشتے کبھی بھی ٹوٹ نہیں سکے

تلوار کی آڑ میں لاتعداد انسانی جسموں سے بہے لہو کی لالی دونوں ملکوں کے قلم کاروں کے قلم کی سیاہی بنی ہے ——— جنگ کی تباہ کاریوں نے دونوں ملکوں کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے دلوں کو درد کی شدت سے ہمکنار کیا ہے اور حالات کے اسی پس منظر میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، رامانند ساگر، احمد ندیم قاسمی، اشفاق حسین، خواجہ احمد عباس، اشفاق احمد، امرتا پریتم، جمیلہ ہاشمی، جسونت سنگھ، جوگیندر پال، شوکت صدیقی، امجد اسلام امجد، حمد وار ——— اور کئی دوسرے قلم کاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اس انسانی درد کی عکاسی کی ہے جسے ہم دونوں طرف کے عوام کا درد کہہ سکتے ہیں۔ شاید ذہن کی یہی وہ سوچ ہے ——— اور دل کی دھڑکنوں میں بسی یہی وہ تڑپ ہے جس نے قلم اور ادب کے رشتے سے دونوں ملکوں کے درمیان جذباتی قسم کا ایک رشتہ بنائے رکھا ہے جو ہزار اختلافوں اور دشمنوں کے باوجود ٹوٹ نہیں سکا ——— شاید کبھی ٹوٹ نہیں سکے گا

لیکن پاکستان جانے کے لیے ویزا حاصل کرنے کی جو شرائط، قواعد اور قانون ہیں ان کے تحت ادیبوں کے اس رشتے کی کوئی اہمیت نہیں اور اسی لیے مجھے ہر بار ویزا دینے میں معذوری کا اظہار کیا گیا تھا

گذشتہ برس یعنی ۱۹۸۵ء کے شروع میں خبر ملی کہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوششوں کے تحت بھارت سرکار کی طرف سے اُردو ادیبوں اور شاعروں کا ایک وفد پاکستان کے دورے پر جا رہا ہے۔ کسی نے بتایا کہ وفد کے لگ بھگ بیس اراکین میں ایک نام میرا بھی ہے مجھے حد خوشی ہوئی اور اس مدعی کو میری دیرینہ آرزو پوری ہونے والی ہے لیکن مہینوں گذر جانے کے باوجود نہ تو وفد کے اراکین کا فیصلہ ہو سکا اور نہ ہی روانگی کی کوئی قطعی تاریخ طے ہو سکی آخر ماہِ دسمبر میں فیصلہ ہو گیا کہ بھارتی ادیبوں کا وفد مشہور شاعر جناب کنور مہیندر سنگھ بیدی سحر کی قیادت میں ۷ جنوری کو دہلی سے پاکستان کے لیے روانہ ہو گا جس میں تین سرکاری اراکین کے علاوہ صرف نو ادیب اور شاعر ہوں گے۔ اس فہرست میں میرا نام نہیں تھا مجھے ایک بار پھر مایوسی ہوئی

مشعلِ راہ

میں نے کنور مہیندر سنگھ بیدی صاحب سے ذکر کیا تو انھوں نے فوراً ہی مسئلہ حل کر دیا۔ ویزا جاری کرانے کی ذمہ داری انھوں نے لے لی اور ساتھ ہی مشورہ دیا کہ میں بھی اپنا پروگرام وفد کے پروگرام کے مطابق ہی بنالوں تاکہ پاکستان میں قیام کے دوران مجھے کوئی پریشانی نہ ہو۔ بیدی صاحب کے ساتھ میری بات چیت ۱۶ دسمبر کی شام کو جیمسفورڈ کلب نئی دہلی میں ہوئی جہاں میرے عزیز دوست شری سبھاش متل ممبر پارلیمنٹ بھی موجود تھے متل صاحب کی رائے بھی یہی تھی کہ میں بیدی صاحب کے مشورے کے مطابق ہی اپنا پروگرام طے کروں اس لیے کہ پاکستان میں ذاتی طور پر کسی سے بھی میری جان پہچان نہیں تھی اور یوں بھی میں پہلی بار پاکستان جا رہا تھا اُن کی رائے میں وزن تھا اور اس حقیقت سے میں بخوبی واقف تھا کہ کنور مہیندر سنگھ بیدی کی شخصیت کا قد بہت اونچا ہے بھارت کی طرح ہی پاکستان میں بھی وہ بے حد مقبول ہیں اور محبت و دوستوں کے ایسے رشتے انھوں نے استوار کیے ہیں جو لازوال ہیں وہاں چھوٹے بڑے سبھی لوگ انھیں بے پناہ محبت کرتے ہیں پاکستان کے صدر جناب ضیاء الحق سے اُن کی بڑی ہی پیاری دوستی ہے اُن کے ساتھ ساتھ سفر کرنا یقیناً میرے لیے باعثِ فخر ہو گا بیدی صاحب نے بتایا کہ اُن کی قیادت میں بھارتی ادیبوں کا وفد ۷ جنوری کو دہلی سے کراچی کے لیے روانہ ہو گا اور وہاں سے اسلام آباد ہوتے ہوئے ۱۵ جنوری کو لاہور پہنچے گا اور ۱۸ جنوری کو وہ لوگ بھارت لوٹ آئیں گے وفد میں ڈاکٹر

گوپی چند نارنگ، جناب جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر حامدی کاشمیری، اُردو پروموشن
بیورو کی ڈائریکٹر محترمہ فہمیدہ بیگم وغیرہ اراکین شامل ہوں گے۔ پاکستان میں وفد کے قیام اور دیگر
تفصیلات پاکستان سرکار طے کرے گی۔ میں سرکاری وفد کا رکن ہوتا تو بات دوسری تھی، لیکن اب جب
کہ مجھے اپنے طور پر سفر کرنا تھا اور خرچ کے علاوہ دیگر تمام انتظامات بھی مجھے ہی کرنے تھے اس لیے میں نے
نیدی صاحب سے درخواست کی کہ وہ فی الحال میرے لیے ویزا حاصل کرنے کا بندوبست کر دیں، پروگرام
بعد میں طے کر لیا جائے گا۔ درحقیقت سرکاری وفد کے ساتھ غیر سرکاری یا ایک فالتو قسم کی چیز ہونے کا احساس
مجھ میں پیدا ہوا تھا اور بھاری بھر کم ادبی شخصیتوں کے ساتھ اپنی ادبی شخصیت کو میں محض ایک سایہ
نہیں بنا دینا چاہتا تھا، اس لیے میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے سفر کا پروگرام میں اپنے
طور پر مرتب کروں گا۔

اُسی روز مجھے پتہ چلا کہ پاکستان کی مقبول ناول نگار محترمہ بُشریٰ رحمٰن دہلی آئی ہوئی ہیں۔ میں نے
کئی جگہ ٹیلی فون گھما کر اُن کے راجدھانی میں قیام کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا چاہی لیکن مجھے ناکامی
ہوئی۔ اگلے روز ۱۷ دسمبر کو ماہنامہ شمع سُشما کے ایڈیٹر اور اپنے بہت ہی عزیز دوست جناب یونس
دہلوی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ کل سے ہی بُشریٰ رحمٰن لُدھیانہ میں مجھ سے فون پر رابطہ قائم
کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اور یہ بھی کہ اُن کی رہائش گاہ پر ایک دعوت عشائیہ کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں
بُشریٰ رحمٰن کے علاوہ ممتاز افسانہ نگار عصمت چغتائی اور سلمیٰ صدیقی اور بہت سے دوسرے افسانہ نگار و ادیب
مدعو تھے۔ یونس دہلوی نے مجھ سے سخت گلہ کیا کہ میں نے کل ہی اپنے دہلی آنے کی اطلاع انھیں کیوں نہیں
دی۔ اس بات کا افسوس مجھے بھی ہوا تب انھوں نے اِدھر اُدھر فون گھما کر بُشریٰ رحمٰن کو تلاش کرنے اور
انھیں میری دہلی میں آمد کی اطلاع دینے کی بہت کوشش کی لیکن یہ کام مشکل تھا کیونکہ اُسی روز پاکستان
کے صدر جناب ضیاء الحق بھارت کے پردھان منتری جناب راجیو گاندھی سے ملاقات کرنے دہلی تشریف
لائے تھے اور اُسی روز انھیں اسلام آباد لوٹ جانا تھا۔ بُشریٰ رحمٰن اُن کے ساتھ مصروف تھیں اور شام کو
اُن کے ساتھ ہی پاکستان لوٹ گئی تھیں۔ اس طرح میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک پیغام کے
ساتھ اپنی چند کتابیں وہ میرے لیے یونس دہلوی کے پاس چھوڑ گئی تھیں۔

یونس دہلوی صاحب کو میں نے اپنے پاکستان کے دورے کے بارے میں بتایا تو انھوں نے

مجھے ویزا حاصل کرنے سے لے کر سفر سے متعلقہ تمام باتوں کی نہ صرف جانکاری دی بلکہ بہت سے مفید مشورے بھی دیے صحیح معنوں میں وہ اس سلسلے میں میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے بہت سی کام کی باتیں اگر وہ نہیں بتاتے تو یقیناً مجھے کئی طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے اِن دنوں میری ملاقات نہیں ہوسکی لیکن بذریعہ خط انھوں نے پہلے ہی مجھے بہت سی باتوں کی جانکاری دے دی تھی بعد میں پھر ماہنامہ "بیسویں صدی" کے مدیر جناب رحمٰن نیر اور پھر ماہنامہ شاعر بمبئی کے مدیر جناب سرور تونسوی سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں پاکستان کے ادبی سفر کے بارے میں انھوں نے بھی میری رہنمائی کی

اس حقیقت سے میں آگاہ تھا کہ پاکستان کے ادبی حلقوں میں ماہنامہ "شمع" اور "بیسویں صدی" دونوں جریدے نہ صرف بہت مقبول ہیں بلکہ دونوں ملکوں کے ممتاز ادیب ان دونوں رسالوں میں برابر لکھتے رہتے ہیں۔ "بیسویں صدی" تو پاکستان میں باقاعدہ جاتا ہے لیکن "شمع" پر وہاں کی سرکار نے ایک عرصے سے پابندی عائد کی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود "شمع" پڑھنے والے اس رسالے کو کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیتے ہیں اور اس پر کافی زیادہ قیمت ادا کرنا بھی گوارا کر لیتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ "شمع" پاکستان میں کس قدر مقبول ہے گذشتہ بیس سالوں سے میں ان دونوں پرچوں میں باقاعدگی سے لکھتا آرہا تھا اس لیے پاکستان میں اپنی پہچان ہونے کا مجھے یقین تھا جناب کنور مہیندر سنگھ بیدی کی مدد سے مجھے آسانی سے ویزا حاصل ہوگیا اور اس طرح میں اپنے پاکستان کے دورے کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔

بھارتی ادیبوں کے وفد نے اپنے سرکاری دورے کے آخری پڑاؤ پر ۱۵ ر جنوری کی شام کو لاہور پہنچنا تھا میں نے براستہ واگہ بارڈر ۱۵ ر جنوری کو لاہور پہنچنے کا پروگرام بنایا تھا تاکہ میں دو روز لاہور میں ان کے ساتھ گذار سکوں۔ میرا ابتدائی پروگرام پاکستان میں تین ہفتے گذارنے کا تھا اور لاہور کے علاوہ مجھے کراچی، راولپنڈی، اسلام آباد اور سرگودھا کا ویزا حاصل ہوگیا تھا تمام مراحل سے گذرنے کے بعد میں نے پاکستان میں اپنے اُن تمام دوستوں کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی جن سے میرے ادبی و قلمی مراسم تھے لاہور میں بشریٰ رحمٰن، عطا الحق قاسمی، انور سدید، مقبول احمد دہلوی کراچی میں رئیس امروہوی، راغب شکیب، ڈاکٹر جمیل جالبی، محشر جعفری سرگودھا میں ڈاکٹر وزیر آغا اور

راولپنڈی، اسلام آباد میں سلطان رشک، عبدالصمد وغیرہ احباب تھے جن سے میرے قلمی تعلقات تھے اور گاہے بہ گاہے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی لیکن سارے پاکستان میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں تھا جس سے میری ذاتی ملاقات ہو۔

ہر ادیب حساس اور جذباتی ہوتا ہے اُس کے ایسے رشتے ناطے بھی جذباتی ہوتے ہیں پاکستان جو میرے جنم کی دھرتی تھا اور جو میرے ادب کی سرزمین تھا، وہاں جانے کے تصور سے میرا انگ انگ اٹھتا تھا اور ساتھ ہی کبھی کبھی یہ احساس بھی جاگتا تھا کہیں ان جذباتی رشتوں کی پہچان کر در نہ ہو مشہور ساحر کرشن ادیب جو میرا نہایت ہی بے تکلف دوست ہے اور پاکستان میں جس کے سسرال بھی ہیں، میرے جذبوں کی شدت محسوس کرتے ہوئے کہتا ــــــــ "تم وہاں پہلی بار جا رہے ہو لیکن ایک لمحہ بھی اپنے آپ کو بیگانہ محسوس نہ کروگے" اور ساتھ ہی اپنے گذشتہ دورۂ پاکستان کی کہانی سناتا ــــــــ قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی، امجد اسلام امجد اور اے حمید کی بے پناہ محبت کی مثالیں دیتا ــــــــ اور اُس کی باتوں سے مجھے حوصلہ ملتا۔

روانگی کی تیاری

پاکستان روانہ ہونے سے دو روز قبل میرے حوصلے کو تب مزید تقویت حاصل ہوئی جب لاہور سے کشری رحمٰن کا تار موصول ہوا جس میں انھوں نے تاکید کی تھی کہ میں اپنے پروگرام کی تفصیل سے انھیں بذریعہ تار اطلاع دوں اُسی روز دوپہر کی ڈاک سے عطاء الحق قاسمی کا خط بھی ملا ــــــــ لکھا تھا ــــــــ "تم جلدی چلے آؤ ــــــــ ہم سب تمہارے منتظر ہیں ــــــــ" اِسی طرح کا ایک بہت ہی پیارا خط سرگودھا سے ڈاکٹر وزیر آغا کا بھی ملا۔ کشری رحمٰن کو میں نے بذریعہ تار اپنے پروگرام سے مطلع کردیا اور اطمینان سے روانگی کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔

۱۴ جنوری کی دوپہر کو میں امرتسر اپنے ایک بہت پرانے دوست ملدیو بیتر سوئی صاحب کے یہاں پہنچ گیا روانگی کے وقت میرے سوٹ کیس میں پہننے کے ذاتی کپڑوں کے علاوہ چند خاص دوستوں کے لیے چھوٹے موٹے تحائف تھے اور دستی بیگ میں میری اپنی کتابوں کے علاوہ کرشن ادیب کی نئی کتاب "ساحر ــــــــ یادوں کے آئینے میں" کی چند جلدیں تھیں دہلی کے نفس ادب

دوستوں نے پاکستان میں اپنے دوستوں کو دینے کے لیے کتابیں دی تھیں ہیرو سائیکل کے مالک اور میرے دوست جناب ادم پرکاش مُنجال نے نئے سال کی ہیرو ڈائری کی درجن بھر کاپیاں خصوصاً میرے حوالے کردی تھیں تاکہ ہیں اوران کی طرف سے محبت کے تحفے کے روپ میں انھیں میں پاکستانی دوستوں کی خدمت میں پیش کردوں۔ بھارتی ادیبوں کی طرف سے اپنے پاکستانی دوستوں کے نام خطوط تھے جو مجھے وہاں تک پہنچانے تھے۔ فرمائشوں کی ایک طویل فہرست بھی میرے سفری بیگ میں تھی ——— کتابوں کی فرمائش ——— بعض پاکستانی رسالوں کی فرمائش ——— پاکستانی غزلوں کے کیسٹ کی فرمائش ——— وغیرہ۔ یعنی میرے مختصر سے سامان کی حالت بھی میرے دل جیسی ہی تھی ——— خدمات ——— محبت اور خلوص!

یوں اپنے مختصر سامان کے ساتھ میں ۱۵ / جنوری کو دلی اور واہگہ سرحد پر موجود تھا ——— اپنا پاکستان کا سفر شروع کرنے کے لیے!

واہگہ کے اُس پار

واہگہ سرحد پران دنوں آمدورفت بہت کم تھی اس کی سب سے بڑی وجہ بھارتی پنجاب میں غیرملکیوں کے داخلے پر لگی پابندی تھی۔ جو پاکستانی بھارت میں آتے ہیں اور یا جو بھارت سے پاکستان جاتے ہیں وہ ہوائی سفر کے علاوہ گاڑی میں سفر کرتے ہیں یہ مخصوص گاڑیاں ہفتے میں دو دن لاہور آتی جاتی ہیں اور انھیں اٹاری چیک پوسٹ پر چیک کرنے کے بعد اس طرح روانہ کیا جاتا ہے کہ یہ پنجاب کے کسی اسٹیشن پر نہ رکیں۔ ایسی آمدورفت عموماً واہگہ سرحد پر نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن دنوں واہگہ چیک پوسٹ پر کوئی خاص گہما گہمی نہیں تھی۔

ایک قلی نے میرا مختصر سا سامان اٹھایا کسٹم حکام نے میرا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات دیکھے ——— ضروری کارروائی کی۔ کاؤنٹر پر موجود ایک افسر نے جس کی ڈیوٹی سامان چیک کرنے کی تھی، میرا پاسپورٹ دیکھنے کے بعد بغور میرا جائزہ لیا اور سوال کیا ———

"کیا آپ وہی ڈاکٹر کیول دھیر ہیں جو کہانیاں لکھتے ہیں ——— اور جن کے پروگرام اکثر ٹیلی ویژن پر آتے ہیں؟"

"جی ہاں ————!"

اُس نے خوشی کا اظہار کیا ———— چائے کی پیش کش کی ———— مختصر میں جیسے
چھوٹی چھوٹی باتیں کیں اور سامان کی چیکنگ کیے بغیر قلی کو آگے لے جانے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی تاکید
کی کہ وہ مجھ سے اپنی مزدوری وصول نہ کرے۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور قلی کے ساتھ ساتھ آگے
بڑھ گیا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے سماج میں میری پہچان ہو رہی ہوتی ہے لیکن سماج کا ایک عام آدمی
کسی قلم کار کو اُس کے ادیب ہونے کے رُوپ میں پہچانتا ہے ———— اپنی محبت اور احترام کا اظہار
کرتا ہے تو وہ لمحے ایک عجیب سی مسرت کا احساس لیے دل کی عمیق گہرائیوں تک اتر جاتے ہیں۔ میں
بطور ایک ادیب پاکستان کے سفر پر روانہ ہوا تھا اور ادیب کے روپ میں اپنی پہچان پا کر وہ لمحے
مجھے بے حد پیارے لگے تھے۔ تب بھول جانے کی کوشش کی تھی کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں ———— مجھے
محسوس ہوا تھا کہ میں ایک ادیب ہوں۔

آزاد زمین کا ٹکڑا

یہ سب سوچتے ہوئے میرے قدم واگہ سرحد کے فرلانگ بھر کے اُس راستے پر آگے بڑھ رہے
تھے جو بھارتی اور پاکستانی چیک پوسٹ کے درمیان تھا اور جسے آزاد زمین کا ٹکڑا" (NO
MAN LAND) کہا جا سکتا ہے۔ یہ زمین کسی بھی دوسری زمین جیسی ہی تھی ————
اس دھرتی کی کوکھ سے اُگے پیڑ پودے اور درخت بھی ویسے ہی تھے ———— اس دھرتی پر
چلنے والی ہوائیں بھی وہی تھیں لیکن اِس دھرتی کی سوندھ ہواؤں کی نمی میں جو احساس تھا صرف وہی
مختلف تھا۔ احساس کے یہ لمحے بے حد اہم ہوتے ہیں ان میں تڑپ ہوتی ہے ———— درد نہیں
ہوتا اِن میں سوچ آزاد ہوتی ہے ———— بوجھ نہیں ہوتا۔ آزادی، احترام، دوستی اور اس
کے احساس کے انہیں لمحوں کی ضرورت آج تمام عالم کو ہے ———— ساری انسانیت کو ہے۔
کاش کہ احساس کے یہ لمحے اِن ذہنوں میں بھی کبھی سما پاتے جو امن اور آشتی ———— محبت اور دوستی
کے دشمن ہیں ————،

احساس کے ان لمحوں کی خوشبو سے شرابور میرا ذہن صرف سوچ رہا تھا اور میرے قدم آگے

بڑھ رہے تھے۔ سوچ کا سلسلہ ٹوٹتے ہی لمحے بکھر گئے۔ ایک مزدور میرا سامان دوسرے مزدور کے حوالے کر رہا تھا۔ ایک مزدور ہندوستانی تھا اور دوسرا پاکستانی آزاد دھرتی کے اس ٹکڑے کا سفر پورا ہو گیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد میرے قدم اُس دھرتی کو چھونے والے تھے جو پاکستان کی دھرتی ہے دس کا نوٹ نکال کر میں نے قلی کی طرف بڑھا دیا بار بار انکار کرنے کے بعد آخر مجبوراً اُس نے قبول کر لیا۔

خوش آمدید

اس میں واہگہ کے اُس پار پاکستانی چیک پوسٹ میں تھا جہاں ہندوستانی چیک پوسٹ کی طرح ہی میرے پاسپورٹ اور دیگر کاغذات کو دیکھا گیا ——— کچھ اندراج کیے گئے اور اس کارروائی میں مشکل پانچ سات منٹ لگے۔ قلی میرا سامان ایک وسیع ہال میں کاؤنٹر پر رکھ کر باہر آ گیا آنے اور جانے والے آٹھ دس مسافروں کا سامان پہلے ہی وہاں موجود تھا اور جس باریکی سے سامان کی چیکنگ ہو رہی تھی اُس سے مجھے اندازہ ہوا کہ فارغ ہونے میں مجھے کم از کم آدھا گھنٹہ لگ جائے گا۔ سگریٹ سلگا کر میں ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ تبھی ایک نوجوان لڑکی اور ایک مرد جو پاکستانی کسٹم کے آفیسر تھے، میرے سامان کے نزدیک بڑھ آئے لڑکی مجھ سے مخاطب تھی ———

"یہ سامان آپ کا ہے؟"

"جی ——— "

"اس میں کیا ہے؟"

"آپ ہی دیکھ لیجیے ——— " اور چابیاں میں نے اُس کی طرف بڑھا دیں۔ بیگ کی زنجیر میں نے خود ہی کھول دی مرد آفیسر نے بیگ میں پڑی کتابوں کو غور سے دیکھا جس پر میری تصویر چھپی ہوئی تھی اور پھر مجھے دیکھنے لگا

"آپ ادیب ہیں؟" اُس نے کہا اور میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ میرا پاسپورٹ دیکھتے ہوئے اُس نے پھر کہا ——— "لیکن پاسپورٹ میں تو ڈاکٹر لکھا ہوا ہے!"

"کیا ایک ڈاکٹر ادیب نہیں ہو سکتا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ دونوں بھی مسکرا دیے۔

"ہوسکتا ہے ـــــ لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے" لڑکی کہہ رہی تھی ـــــ "آپ کہاں جائیں گے ؟"
"پاکستان ـــــ" میں نے فوراً کہا۔
"خوش آمدید ! ـــــ پاکستان میں تو آپ پہنچ گئے ـــــ یہاں کہاں جائیں گے ؟"
لڑکی ہوشیار، ذہین اور باسلیقہ تھی
"میرے سفر کا پہلا پڑاؤ لاہور ہے"
"لاہور میں آپ کہاں ٹھہریں گے ؟"
"ڈسٹرکٹ جج کے یہاں !"
میں نے دیکھا ـــــ محسوس کیا ـــــ کہ ڈسٹرکٹ جج کا نام سنتے ہی وہ لڑکی بے حد متاثر ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی تھی۔ دل کی کیفیت کا ردِ عمل اُس کے چہرے پر نمایاں تھا۔ ـــــ ردِ عمل جو محبت، احترام اور عظمت سے پیدا ہوتا ہے۔ ہماری اس مختصر سی بات چیت کے دوران ہی مرد آفیسر شاید کسی کام سے دوسری طرف چلا گیا تھا جبکہ وہ لڑکی میری طرف صرف دیکھتی رہی تھی اور پھر جاتے ہوئے مجھے لوٹاتے ہوئے بولی تھی ـــــ "آپ ہمارے معزز مہمان ہیں ـــــ"
"سامان چیک نہیں کریں گی ؟" میں نے کہا تھا۔ الفاظ کی زبان میں نہیں، آنکھوں کی زبان میں اُس نے انکار کر دیا تھا

شاید بات چیت کا یہ سلسلہ ابھی جاری رہتا ـــــ لیکن اسی دوران اسی مرد کسٹم آفیسر کے ساتھ ایک نوجوان میرے قریب آکر رک گیا۔ اُس نے اپنا تعارف دیا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ ڈسٹرکٹ جج کا ڈرائیور ہے ـــــ نوجوان ڈرائیور نے بتایا کہ وہ گاڑی لے کر مجھے واہگہ سرحد پر لینے آیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ گھنٹہ بھر قبل ہی میرا تار بیگم صاحبہ (ڈسٹرکٹ جج) کو ملا ہے اور فوراً ہی انہوں نے مجھے آپ کو لینے کے لیے یہاں بھیج دیا ہے۔ مجھے حیرانی، خوشی اور اطمینان کا احساس ساتھ ساتھ ہوا۔ یہ میرے جذبات کا فوری ردِ عمل تھا۔ ڈرائیور نے میرا مختصر سا سامان گاڑی میں رکھا اور میں پاکستانی کسٹم حکام کا شکریہ ادا کرکے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

واہگہ سے لاہور کی طرف

واہگہ سرحد کے اُس پار بھی زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ مسافروں کو لاہور لے جانے کے لیے چند ٹیکسیاں

اور موٹر گاڑیاں مسافروں کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ ہماری گاڑی لاہور کی جانب سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ تار کول کی ویسی ہی سیاہ سڑک تھی سڑک کے کناروں پر اُسی طرح ویسے ہی درخت تھے اور دائیں بائیں دُور دُور تک پھیلے لہلہاتے وہی کھیت تھے ـــــــ مَیں ابھی کچھ دیر قبل میں اپنے دیس کی دھرتی پر چھوڑ آیا تھا لیکن اب میں پاکستان کی دھرتی پر تھا میں اپنے احساس اور جذبات کے پروں پر پرواز کر رہا تھا اور ویر محمّد رُک رُک کر چھوٹے چھوٹے سوال مجھ سے کر رہا تھا ـــــــ میں کون سی زبان بولتا ہوں ـــــــ واہگہ سے پرے بھارت میں میرا شہر کون سا ہے ـــــــ لدھیانہ واہگہ سے کتنی دُور ہے ـــــــ مَیں وہاں سے کب روانہ ہوا تھا ـــــــ راستے میں مجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ـــــــ کسٹم والوں نے پریشان تو نہیں کیا ـــــــ وغیرہ وغیرہ۔

اِسی دوران سڑک کے کناروں پر سے چھوٹے چھوٹے گاؤں راستے میں آئے۔ وہ ان کے بارے میں بھی مجھے بتاتا رہا چند ہی منٹوں میں ہم اس شہر کو پار کر گئے جہاں تک گذشتہ بھارت پاک جنگ کے وقت ہندوستانی فوج لاہور کی سرحد تک پہنچ گئی تھی۔ یہ بات ویر محمّد نے مجھے بتائی تھی اور مجھے یاد آیا تھا کہ تب جنگ بندی لاگو ہونے کے بعد دوسرے روز ہی جیپ میں سوار ہو کر ایک پریس پارٹی کے ساتھ مَیں بھی یہاں آیا تھا۔ تب یہاں جنگ کی تباہ کاریوں کے نشان تھے ـــــــ ویرانی تھی لیکن آج ویسا کچھ بھی نہیں تھا۔ زندگی کی دَوڑ میں شریک ہر انسان اپنے کام میں مصروف دکھائی دے رہا تھا۔

لاہور کی حُدود میں

چند لمحوں بعد ہماری گاڑی لاہور کی آبادیوں میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک دوسرے دیس کی دھرتی پر ہونے کے جذباتی احساس کے سوا مجھے کچھ بھی الگ سا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ماحول بھارت کے کسی بھی بڑے شہر جیسا ہی تھا ویسی ہی عمارتیں، دوکانیں اور سڑکیں تھیں ـــــــ سڑکوں پر رینگتی ویسی ہی بے شمار کاریں تھیں ـــــــ بالکل ویسا ہی ٹریفک تھا اور اتنی ہی سردی یہاں تھی جتنی لدھیانہ یا امرتسر میں تھی

فوری طور پر تھوڑا بہت فرق مَیں نے محسوس کیا وہ یہاں کے لوگوں کی پوشاک میں تھا۔ اکثر لوگ قمیص شلوار اور جیکٹ پہنے آتے جاتے دکھائی دیے بہت کم لوگ ایسے نظر آئے جنہوں نے

انگریزی لباس یعنی کوٹ پینٹ پہن رکھے ہوں۔ بے تک سردی کا موسم تھا لیکن دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے لوگوں کی زیادہ بھیڑ بھاڑ دکھائی نہیں دی شاید اس کی وجہ یہ لاہور کا بیرونی علاقہ تھا ——— نئی آبادیاں تھیں اور کام کا دن تھا۔

لاہور کی حدود میں داخل ہوتے ہی گاڑی نہر کے کنارے کنارے دوڑنے لگی تھی یہ نہر لاہور کے ساتھ ساتھ ہی نہیں بلکہ وسط میں چلتی ہے اسی نہر کے ساتھ لاہور شروع ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ نہر کے دونوں طرف نہایت خوبصورت اور کشادہ سڑکیں ہیں ——— بڑی بڑی بلڈنگیں بھی ہیں۔ نہر کے کنارے کنارے لمبے لمبے اونچے درخت ہیں کناروں پر ہری ہری گھاس قالین بچھے دکھائی دیتے ہیں جگہ جگہ بیٹھنے کے لیے سیمنٹ کے بنے بینچ ہیں ان دنوں نہر خشک تھی اور اس کی سطح اور کناروں کو پختہ کرنے کا کام چل رہا تھا تاکہ اس میں بہنے والے میلے پانی کی خوبیوں میں اضافہ کیا جا سکے اس کے تصور سے ذہن میں ایک عجیب سی شگفتگی کا احساس پیدا کیا۔ نہر کے کنارے کا یہ سفر مجھے بہت اچھا لگا تھا

پہلی ملاقات رحمٰن پریوار سے

نہر کے کنارے بھاگتی ہوئی گاڑی کی رفتار مدھم ہوئی اور ریل کو کاٹتی ہوئی ماڈل ٹاؤن حاجی کی چھوٹی سڑک پر مڑی تو ویر جی نے بتایا کہ ہم نیو گارڈن ٹاؤن کے احمد پارک علاقے میں داخل ہو رہے ہیں اور ہماری منزل یعنی مسز رحمٰن کا بنگلہ یہاں سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر واقع ہے بات ختم ہوتے ہوتے ہماری گاڑی بنگلے کے صدر دروازے تک پہنچ گئی تھی اور ایک دوسری گاڑی صدر دروازے سے باہر آرہی تھی۔ یہ مسز رحمٰن کے شوہر میاں عبدالرحمٰن صاحب کی گاڑی تھی جسے وہ خود ڈرائیو کر رہے تھے ہماری گاڑی بنگلے میں داخل ہوئی تو رحمٰن صاحب بھی اپنی گاڑی واپس لے آئے لیکن کہ ہم لوگ ایک دوسرے سے یوں بغل گیر ہوگئے جیسے دو بھائی مدتوں بعد ملے ہوں اجنبیت کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا چند لمحوں بعد ہم ایک وسیع ڈرائنگ روم میں تھے جہاں مسز رحمٰن پہلے سے موجود تھیں۔

مسکانوں اور مسرتوں کے ساتھ ہم اپنوں کی طرح ملے لمحہ بھر کے لیے بھی بیگانگی اور اجنبیت کا احساس نہیں ہوا تکلف نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یوں لگا کہ جیسے بہت مدت بعد آج پھر ملے ہوں حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ

میاں رحمٰن صاحب اور نسترن رحمٰن سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور ہم پہلی بار ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔

نسترن رحمٰن کی چند کہانیاں میں نے پڑھی تھیں ——— مختلف جریدوں میں شائع ہوئی اُن کی چند تصویریں دیکھی تھیں اور ماضی میں ہمارے درمیان چند خطوط کا تبادلہ ہوا تھا میری اُن سے بس اتنی سی واقفیت تھی اُن کے شوہر میاں رحمٰن صاحب کے بارے میں میری ذرا بھی واقفیت نہیں تھی محض سُن رکھا تھا کہ وہ بہت امیر آدمی ہیں اور اُن کا کاروبار پاکستان کے علاوہ دُنیا کے بعض دوسرے ممالک میں بھی ہے ایسے میں میرے ذہن میں تصور کی جو تصویر بنی تھی وہ ویسی نہیں تھی جیسی میں حقیقت میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور دل کی حد تک محسوس کر رہا تھا اکثر بڑے اور دولت مند لوگوں کی طرح شاید یہ لوگ بھی مغرور ہوں گے۔ ان کا رہن سہن ما حیث طور طریقے شاید سائنٹی ہوں گے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا میری کمزور سوچ اپنے آپ ہی پگھل کر ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی نسترن رحمٰن کی شخصیت کا تصور میرے ذہن میں قدرے مختلف تھا ہمیشہ ہی میری یہ رائے رہی ہے کہ قلم کار یا ادیب کی شخصیت کا روپ اندر اور باہر سے ایک ہی ہوتا ہے۔ درحقیقت جو کچھ بھی وہ ہے اس پر کسی طرح کی ساوٹ کا لبادہ وہ اوڑھ نہیں سکتا۔ کسی ناول نگار یا افسانہ نگار کے بارے میں تو یہ بات زیادہ وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے اُس کی تحریریں اور کردار اُس کی اپنی شخصیت کے زیر اثر ہوتے ہی ہیں۔ کہیں نہ کہیں ان کرداروں میں وہ خود بھی نمایاں نظر آجاتا ہے۔ نسترن رحمٰن کے جن چند افسانوں کو میں نے پڑھا تھا اُن میں واضح طور پر اُن کی شخصیت کو محسوس بھی کیا تھا ——— ایک پیاری، خوبصورت نازک اور کھلے دل و دماغ کی شخصیت، ایسی ہی شخصیت حقیقت میں اس وقت میرے سامنے تھی ———

اور حقیقت کے اس احساس سے مجھے قلبی مسرت کا بھرپور احساس ہوا تھا۔

اس وقت نسترن رحمٰن نہایت سادے کپڑے پہنے کسی گھریلو عورت کی طرح گھر کا کام کاج دیکھ رہی تھیں۔ میاں رحمٰن اپنی تمام تر مصروفیات کو بھول کر میرے ساتھ محوِ گفتگو ہو گئے تھے جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا، رحمٰن صاحب کاروباری آدمی ہیں اور مختلف ممالک میں اُن کا وسیع کاروبار ہے لیکن اُن کا ذہن صرف کاروباری نہیں ہے ادب، فلسفہ، مذہب، سیاست، انڈسٹری ——— غرضیکہ کسی بھی موضوع پر وہ لگا تار اور گھنٹوں باتیں کر سکتے ہیں۔ اُن کا مطالعہ بے حد وسیع ہے ——— اور وہ گھنٹوں مختلف موضوعات پر بہت کھل کر باتیں کرتے رہے اس دوران چائے، دوپہر کا کھانا، قہوہ، چائے اور پھر چائے کے دور چلے اور ہر لمحہ اُن کی دلچسپ

باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ بات چیت میں میں شریک تھا، کشوری بھی شریک تھیں لیکن آج کا
دن تھا۔ کشوری نے بتایا تھا کہ آج مہینوں بعد ایسا دن آیا ہے کہ رحمٰن صاحب صرف اتنا وقت محفل
بلکہ ایک مدت کے بعد ہم لوگوں نے ساتھ ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا ہے۔ اس کا کریڈٹ وہ مجھے دے رہی
میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کر رہا تھا کہ ان جیسے سادہ، کھلے دل اور کھلے دماغ کے باذوق
انسان کا طویل قرب مجھے حاصل ہوا ہے

میاں رحمٰن اور کشوری دونوں ہی اپنی زندگی میں بے حد مصروف ہیں اور ایک مشترکہ زندگی کے علاوہ
ان کی سماجی زندگی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ عملی طور پر میاں کی زندگی کاروباری ہے اور اپنے کاروبار
کے سلسلے میں اکثر انہیں کبھی گھر سے باہر اور کبھی پاکستان کے باہر مختلف غیر ممالک میں جانا پڑتا ہے۔ کشوری بیک
وقت ادیب، صحافی، اور سیاست داں ہیں۔ وہ پاکستانی نیشنل اسمبلی کی ممبر ہیں۔ وہ گھر، بیوی اور ماں
بھی ہیں اور اس طرح گھر، گھر سے اور دیش کے باہر ان کی مصروفیات اپنے شوہر سے ایک دم مختلف ہیں۔ شاید اسی
لیے کشوری نے کہا تھا کہ مہینوں بعد آج رحمٰن صاحب ہمارے ساتھ دوپہر کے کھانے کی میز پر موجود ہیں

آج کا میرا اپنا پروگرام کوئی نہ تھا۔ چند دوستوں کو فون پر لاہور میں اپنی آمد کی اطلاع دینی تھی اور
کنور مہیندر سنگھ بیدی کی قیادت میں بھارتی ادیبوں کے وفد کے لاہور میں آمد اور جائے قیام کے بارے میں
واقفیت حاصل کرنی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں ویسے بھی دن ڈھل گیا تھا، اس لیے مزید کسی طرح کے پروگرام
کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ میرے دونوں کام خود کشوری نے کر دیے اور اطلاع دی کہ بھارتی ادیبوں کا وفد دیر
رات لاہور پہنچے گا اور ان کا قیام لاہور کے بہترین فائیو اسٹار ہوٹل" ہلٹن" میں ہوگا۔ انھوں نے مجھے یہ
اطلاع بھی دی کہ اگلے روز صبح الحمرا آرٹ سنٹر لاہور میں بھارتی ادیبوں کے اعزاز میں ایک شاندار پروگرام
منعقد ہو رہا ہے اور اس سلسلے میں میرے نام کشور کے پاس دعوت نامہ موصول ہو چکا ہے

ادبی سرگرمیوں کا آغاز

لاہور میں یہ میرا پہلا دن تھا۔ اس دن کی مصروفیات صرف باتیں تھیں جو نصف شب تک جاری
رہیں ——— باتیں، جو محبت اور خلوص کو جنم دیتی ہیں، جو جذبوں کے احساس میں رچ بس کر دل کی عمیق گہرائیوں
تک اتر کر وجود کا ایک حصہ بن جاتی ہیں اور جن سے انسان اور انسان کے درمیان نئے رشتے استوار ہوتے ہیں

بھارتی ادیبوں کے وفد کے اعزاز میں تقریب

۱۶ جنوری ——— لاہور میں میرا دوسرا روز تھا۔
نشتری رحمٰن کے ہمراہ میں ٹھیک صبح ساڑھے نو بجے الحمراء آرٹ سنٹر پہنچ گیا گذشتہ روز کا سفر اور رات دیر تک جاگتے رہنے کے باعث صبح کچھ دیر سے سو کر اٹھا تھا ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر الحمرا آرٹ سنٹر بروقت پہنچنے کی جلدی بھی تھی اس لئے آج کے اخبارات کا مطالعہ نہیں کر سکا تھا گھر سے روانہ ہوتے وقت تمام اخبارات ساتھ لے لئے تھے اور گاڑی میں اُن کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا تھا کہ تک بھگ تمام اخبارات نے میری لاہور آمد کی خبر شائع کی تھی اور یہ بھی کہ میرا قیام پاکستان کی ممتاز ادیبہ نشتری رحمٰن کے یہاں ہے بعض اخبارات نے اس خبر کے ساتھ میری تصویر بھی شائع کی تھی اور جب ہم الحمراء پہنچے تو یہ اس خبر کا کرشمہ ہی تھا کہ بہت سے اُن ادیب دوستوں نے جوش آمدید کہتے ہوئے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا جن سے پہلے کبھی ملاقات تک ہوئی تھی، ان لوگوں میں رسالہ "نقوش" کے مدیر جناب محمد طفیل، ڈاکٹر انور سدید جناب ممتاز مفتی، وحیدہ لودھی، سائرہ ہاشمی قدسیہ بانو اکبر کاظمی، میرے دوست جناب مقبول احمد دہلوی اور بے شمار ادبا و شعرا حضرات تھے بھارتی ادیبوں کے وفد کے اراکین جناب کنور مہیندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، حامدی کاشمیری اور ان کی بیگم ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر مسعود حسین، محترمہ رفیعہ سلطانہ دکنی، ابوالفیض سحر ——— وغیرہ تمام لوگ پہلے ہی سے وہاں موجود تھے پاکستان کے نئے اور پرانے قلم کاروں، پبلشروں اور دوسرے لوگوں کا زبردست اجتماع تھا بھارتی سرکاری وفد کے ساتھ ہی غیر سرکاری حیثیت بھی ایک کشش جیسی ہو گئی تھی اور وہاں موجود ہر کوئی بھارتی وفد کے ہر رکن سے ملنے اور مختلف قسم کی باتیں کرنے کا خواہش مند نظر آ رہا تھا۔
آج کی تقریب کا اہتمام جناب غلام ربانی آگرو کی زیر رہنمائی اکادمی ادبیات پاکستان اور نیشنل بک کونسل آف پاکستان کی طرف سے سرکاری طور پر کیا گیا تھا بھارتی وفد اپنے ساتھ اُردو کی پانچ ہزار سے زائد کتابیں لے گیا تھا اور کراچی اسلام آباد کے بعد لاہور میں ان کتابوں کی نمائش لگائی گئی تھی لگ بھگ صبح دس بجے میاں نواز شریف وزیر اعلیٰ صوبہ پنجاب (پاکستان) نے نمائش کا افتتاح کیا اور بعد ازاں الحمراء کے نہایت خوبصورت ہال میں وزیر اعلیٰ ہی نے بھارت میں اُردو ادب، موضوع پر مجلس مذاکرہ کا باقاعدہ افتتاح کیا تقریب میں پنجاب کے وزیر داخلہ کے علاوہ پاکستان میں بھارتی سفیر اور پنجاب اسمبلی کے بعض اراکین نے بھی شرکت کی۔

افتتاحی اجلاس میں وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف، جناب غلام ربانی آگرو، بھارتی سفیر اور بھارتی ادیبوں کے وفد کے قائد جناب کنور مہیندر سنگھ بیدی صاحب نے تقریریں کیں جن میں ادب کے حوالے سے خیر سگالی، خلوص، محبت اور دوستی کے جذبات کا اظہار کیا گیا اور امید ظاہر کی گئی کہ اُردو زبان و ادب دونوں ممالک کے درمیان بہتر تعلقات قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوگا

تقریب کا دوسرا حصہ مجلس مذاکرہ یعنی سیمینار تھا جس میں اُردو ادب کے مختلف موضوعات پر پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر جامدی کاشمیری، ڈاکٹر مسعود حسین اور محترمہ رفیعہ سلطانہ دکنی نے اپنے مقالات پڑھے۔

آج کی افتتاحی تقریب پُر وقار اور شاندار تھی اور قلم کار حضرات کی حاضری بھی قابل ذکر تھی لیکن سیمینار میں موجود حاضرین کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی ان پچاس لوگوں میں بعض طالب علم تھے، بعض سرکاری مجبوری میں محض لوگ اپنا فرض ادا کر رہے تھے اور بقیہ چند لوگ وہ تھے جو بھارتی ادیبوں سے کسی نہ کسی طرح سے وابستہ تھے پاکستان اُردو زبان و ادب کی دھرتی ہے وہاں سیمینار کی یہ حالت دیکھ کر افسوس ہوا اچانک تب یاد آئی بھارت کی جہاں اُردو زباں کی حالت پاکستان کے برعکس ہے یعنی بہت حوصلہ افزا نہیں ہے پھر بھی ہمارے ہاں منعقد ہونے والے سیمینار اس سے کہیں زیادہ کامیاب اور بھرپور ہوتے ہیں

بھارتی کتابوں کی نمائش

میں یہاں اُس نمائش کا ذکر بھی بطورِ خاص کرنا چاہوں گا جس میں بھارت میں چھپی اُردو کی پانچ ہزار سے زائد کتابیں رکھی گئی تھیں اور ان سب کا معیار ہر لحاظ سے بہتر تھا بعض غیر سرکاری اشاعتی اداروں کی کتابیں بھی تھیں جن میں سے کچھ کا معیار تو ٹھیک تھا لیکن ان میں زیادہ تر کتابیں ایسی تھیں جو کسی بھی لحاظ سے معیاری نہیں کہی جاسکتیں چند کتابیں وہ بھی تھیں جو پاکستانی قلم کاروں کی لکھی ہوئی تھیں اور پاکستان میں نہایت اہتمام کے ساتھ اُن کی اشاعت ہو چکی تھی لیکن ان کے ہندوستانی ایڈیشن طباعت کے لحاظ سے گوارہ سے بھی کم تھے نمائش میں ایسی کتابوں کو شامل نہیں کیا جانا چاہیے تھا کیوں کہ ان ہی کے باعث وہاں ہم مذاق کا موضوع بنے اور بہت سے لوگوں کی زبان سے طرح طرح کے جملے نکلے کتابوں کے انتخاب کے لیے ذمہ دار لوگوں کو محتاط ہونا چاہیے تھا

نُشتری رحمٰن افتتاحی تقریب کے فوراً بعد ہی اسمبلی کی ایک میٹنگ کے سلسلے میں وہاں سے چلی گئی تھیں اور بعد دوپہر سیمینار ختم ہونے کے بعد میں مقبول احمد دہلوی کے ساتھ روانہ ہو گیا تھا مجھے پولیس رپورٹ اور پاکستانی

[illegible] کرنے جیسی کارروائیاں کر رہی تھیں ان کاموں میں زیادہ وقت نہیں لگا فارغ ہو کر [illegible] ایک مینار [illegible] قائد اعظم کہا جاتا ہے) اور انارکلی بازار سے پیدل چلتے ہوئے اُردو بازار اور پھر گھر [illegible] ریڈیو پاکستان کے بہت بڑے ادیب مرحوم امتیاز علی تاج کے چھوٹے بھائی سردار محمود سے ملاقات کی

بھارتی وفد کا قیام لاہور کے فائیو اسٹار ہوٹل "ہلٹن" میں تھا وہاں پہنچ کر وفد کے ہمراہ علامہ اقبال کے مزار گئے اور پھر اسی شام اُس مشاعرے میں شرکت کی جو بھارتی وفد میں سے شاعروں کے اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا کیونکہ میں شاعر نہیں ہوں اس لیے دوستوں کی دلچسپ باتوں اور شعرا کے کلام سے لطف اندوز ہوتا رہا

بھارتی وفد کے اعزاز میں ہوٹل ہلٹن میں سرکاری سطح پر ڈنر یعنی رات کا کھانا تھا اور مجھے شرکت کی دعوت دی گئی تھی دن بھر کی مصروفیت اور لگاتار بھاگ دوڑ کے باعث میں کچھ تکان محسوس کرنے لگا تھا قریب ڈیڑھ گھنٹے کا وقت میرے پاس تھا اور ہوں بھی لستری جس سے ہوئی بات کے بعد طے پایا تھا کہ ڈنر کے لیے گھر سے ساتھ ہی روانہ ہوں گے اس لیے میں نے گھر جاکر تھوڑی دیر آرام کرنے کا فیصلہ کیا

ایک عیر ادلی پریشانی

تب ایک پریشان کن واقعہ پیش آیا

لاہور کے لیے میں قطعی اجنبی تھا مقبول احمد دہلوی شام کو ہی مجھ سے الگ ہو گئے تھے لستری جس کی کوٹھی یوگارڈن ٹاؤن کے علاقہ میں واقع تھی اور مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ یہاں سے مجھے کتنی دور جانا تھا میں بالکل اکیلا تھا سڑک کے کنارے تھوڑی دیر میں نے ٹیکسی کا انتظار کیا لیکن ٹیکسی ملی نہیں اچانک ایک آٹو رکشا (جسے ہم ہندوستان میں تھری وہیلر کہتے ہیں) مل گیا اور میں نے پتہ بتا کر اپنا سفر جاری کیا۔ ڈرائیور کو میں نے پہلے ہی آگاہ کر دیا کہ میں بھارتی ہوں، اس شہر کے لئے قطعی اجنبی ہوں اور راستوں کا مجھے علم نہیں ہے اس نے یقین دلایا کہ میں بے فکر رہوں وہ مجھے منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا لیکن میرے اندازے ہی کی طرح اس کی یقین دہانی غلط ثابت ہوئی اور وہ مجھے لاہور کی اندھیری گلی سڑکوں پر بھٹکاتی دیر لیے گھومتا رہا اچھا کُل وقت میرے پاس تھا میں نے ادھر اُدھر سے سن رکھا تھا کہ لاہور کے لوگ بے حد مخلص اور مہمان نواز ہیں اور اسی لیے میں نے بڑی سادگی سے ڈرائیور کو پہلے بھارتی ہونے کی بات بتادی تھی لیکن معلوم نہیں تھا کہ وہ بھی ویسی ہی حرکت کرے گا جیسی اکثر رکشا، تھری وہیلر یا ٹیکسی ڈرائیور مسافروں پر سوار یا دلی میں کرتے ہیں اور اجنبی مسافروں کو

دھوکہ دے کر اُن سے کافی بڑی رقم اینٹھ لیتے ہیں۔ آ ٹو رکشا حب نُسرین کے بنگلے کے سامنے رکا تو رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اور میٹر اسی روپے کی مسافت طے کر چکا تھا

صدر دروازہ کھُلا تھا گاڑی تیار کھڑی تھی اور نُسرین رنج نہایت پریشانی کے عالم میں ٹہل رہی تھیں میں نے لاہور میں اسے پہلے تلخ تجربے کی رُوداد سنائی تو اُن کی پریشانی بڑھ گئی اُن کی آنکھوں میں بھر آئی تشویش اور سنجیدہ چہرے کی پریشانی میں ایک ایسے خلوص کی جھلک میں نے دیکھی ہو کسی ایسے کے لیے محبت بن کر اچانک اُمڈ آتا ہے اور خلوص اور محبت کسی عورت کی آنکھوں میں پیدا ہو تو یہ ماں کے پگھلتے موم کی گرمی سے کم نہیں ہوتا ایک بھائی کے لیے بہن کی آنکھوں میں اُمڈا اور دل میں جو ماوہ پیار ہی تو تھا جو اس وقت میں نے نُسرین میں محسوس کیا تھا

"آئندہ گاڑی اور ڈرائیور ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گے ــــــ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ بخیریت یہاں پہنچ گئے ــــــ" نُسرین نے مجھے تاکید کی کہ میں اسے کسی آدمی کو اسے اجنبی ہونے کی بات نہ کہوں۔ دوسروں کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے والے بُرے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں

تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے تو لاہور کی سڑک پر بھٹکتے ہوئے گذر گئے تھے ڈنر کے لیے ہوٹل ہلٹن پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی اس لئے میں کپڑے بھی نہیں بدل سکا اور ویسی ہی اُجڑی اُجڑی اُکھڑی اُکھڑی حالت میں گھر سے روانہ ہو گئے۔ گھر سے ہلٹن تک کے سفر کے دوران نُسرین کی خاموشی اُس پریشانی کی مظہر تھی جو میری وجہ سے پیدا ہو گئی تھی اِن خاموش لمحوں کو توڑنے کے لیے میں نے بات چیت کا سلسلہ شروع کر دیا اور محسوس کیا کہ بہت جلد وہ پھر اپنے موڈ میں لَوٹ آئی ہیں نُسرین اور خاموشی کا کوئی ساتھ نہیں شوخ، چنچل اور چہچہاتی ہوئی باتیں ہی اُن کی زندہ شخصیت کی علامت ہیں

فائیو سٹار ہوٹل میں دعوت

ہوٹل ہلٹن میں خوب گہما گہمی تھی بہت بڑی تعداد میں پاکستانی اُدباء و شعراء شریک محفل تھے۔ وسیع ہال میں پھیلی مدھم روشنی اور مدھر موسیقی کی فضاؤں میں مدعوئین محوِ گفتگو تھے دائیں کونے کی مختلف میزوں پر ہم بھارتی ادیب تھے اور ہمارے ساتھ ہمارے نئے پرانے ادیب دوست گپ شپ میں مصروف تھے سب سامنے کی میز پر پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو گھیرے ہوئے کشور ناہید تھیں، چند دیگر احباب بھی تھے اور اُن میں نہایت بے تکلفانہ انداز میں ہنسی مذاق چل رہا تھا پروفیسر حامدی کاشمیری اور بیگم حامدی کے ساتھ کچھ لوگ شاید

ادبی موضوع پر سنجیدہ بات چیت کر رہے تھے کنور مہیندر سنگھ بیدی صاحب بہت سے لوگوں میں گھرے ہوئے تھے
اُن کے چہرے پر لگاتار سفر اور مصروفیت کی تھکان واضح تھی لیکن ہر کسی سے وہ بڑی محبت اور مسکراہٹ سے مل رہے تھے
جن بھارتی ادیبوں کا ذکر ابھی میں نے کیا، یہ اور ڈاکٹر خلیق انجم پاکستان میں بے حد مقبول ہیں پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے
اقبالیات پر بہت کام کیا ہے اور یہ پاکستانی ادب کے نقطۂ نظر سے ایک اہم ترین موضوع ہے۔ سر میں پاکستان پرائڈ
کی ادبی خدمات کے لیے انھیں اعزاز بھی حاصل ہو چکا ہے اسی طرح ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، بیدی صاحب اور
ڈاکٹر خلیق انجم کی بھی وہاں الگ ہی پہچان ہے اور ادبی حلقوں میں انھیں ایک خاص مقام حاصل ہے بھارتی
وفد کے دیگر اراکین بھی اپنے مداحوں میں گھرے ہوئے تھے۔

دونوں دیشوں کے سفیر اگر ادیب ہوں،

میرے ساتھ مشہور ادیب جناب میر احمد نوید تھے جو دہلی میں پاکستانی سفارت خانہ میں پریس اتاشی
رہ چکے ہیں۔ بات چیت کے دوران وہ ہندوستان میں قیام کے وقتوں کا ذکر کرتے رہے اپنی یادوں میں شریک
کرتے ہوئے سبھی بھارتی ادیبوں کی باتیں کرتے رہے باتوں باتوں میں میں نے کہا کہ دونوں دیشوں کے سفیر
اگر ادیب ہوں تو آپس کے کئی مسائل خود بخود حل ہو جائیں کیوں کہ ادیب کے دل کی دھڑکن اور ذہن کی ہر سوچ میں
پیار اور دوستی نہاں ہوتی ہے میر کچھ کہنا چاہتے تھے تبھی ہمارے ساتھ بیٹھے ایک صاحب نے کہہ دیا ——" اس
سلسلے میں بیگم بشریٰ رحمٰن اور جناب کنور مہیندر سنگھ بیدی سے زیادہ موزوں شخصیت اور کوئی نہیں ہو سکتی" اچانک
ہی کہی ہوئی اس بات میں وزن تھا اور پھر کافی دیر تک ان دونوں کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں تبھی امجد
اسلام امجد آ گئے۔ وہ مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں تھوڑی دیر کے لیے انور سدید اور کشور ناہید بھی محوِ گفتگو
رہے۔ ہماری میز پر بیگم ذکیہ شاہنواز اور اُن کے شوہر بھی موجود تھے بیگم ذکیہ شاہنواز پاکستان کی پنجاب صوبائی
اسمبلی کی ممبر ہیں اور پسماندہ علاقے سے تعلق رکھتی ہیں وہ اور ان کے شوہر نہرو خاندان کے ساتھ اپنے تعلقات کا
ذکر کرتے رہے، تبھی پنجاب کے صوبائی وزیر مال جناب چودھری اقبال تشریف لے آئے اور کھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا
بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہا کنور مہیندر سنگھ بیدی میرے تعارف کے ساتھ ساتھ میری کہانیوں کا ذکر
کرتے رہے شعر سناتے رہے اور چھوٹے چھوٹے لطیفے بھی۔ کھانے میں نان ویج اور ویج دونوں طرح کا الگ الگ
انتظام تھا اور زیادہ تر لوگ نان ویج کھا رہے تھے۔ میں نے انور سدید کو اپنی پلیٹ میں سبزیاں ڈالتے دیکھ کر

پوچھا تو کہنے لگے ——— "گوشت تو روز ہی کھاتے ہیں ——— آج سریوں کا ذائقہ لیں ——"

رات کے بارہ بج گئے۔ اب لوگ ایک دوسرے سے وداع لے رہے تھے۔ اسامہ زکار استطار حسین، کشتری رئیس، عطاء الحق قاسمی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ہیں وداعگی سے قبل لاؤنج میں کھڑے باتیں کرنے لگے۔ انتظار حسین نے کشتری سے مذاق میں کوئی بات کہہ دی اور کشتری نے اُنھیں ایسے آڑے ہاتھوں لیا کہ پھر وہ ایک بھی بات کہہ پائے۔ کچھ دیر اسی طرح ہنسی مذاق چلتا رہا۔ سیدی صاحب آئے تو ماحول بدل گیا لیکن مذاق میں کمی نہیں آئی۔

"ہمارے لوٹنے کے بعد کپیل دھیر صاحب کا خیال رکھیں ہم امانت آپ کے پاس چھوڑے جا رہے ہیں" سیدی صاحب کشتری سے کہہ رہے تھے۔

"جہاں تک خیال رکھنے والی بات ہے ——— تو ڈاکٹر صاحب میرے بھائی ہیں آپ بے فکر رہیں بہنیں بھائی کا ہمیشہ بہت خیال رکھتی ہیں اور جہاں تک امانت کی بات ہے اس میں خیانت نہیں ہوگی" کشتری کی حاضر جوابی قہقہہ بن گئی۔

سیدی صاحب اور ڈاکٹر نارنگ اجازت لے کر اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔ عطاء الحق قاسمی نے اگلے روز تفصیل سے ملاقات کا وعدہ کیا۔ جناب طفیل ہوشیار پوری نے کشتری سے لفٹ مانگی اور ہم تینوں ہوٹل ہلٹن سے گھر کی طرف روانہ ہو گئے طفیل ہوشیار پوری عمر اور ساری میں بہت بزرگ ہیں لیکن باتوں میں بھی وہ اتنے ہی بزرگ ہیں اس حقیقت کا علم مجھے تب ہوا جب پیس منٹ کے سفر میں اٹھارہ منٹ وہی لوٹتے رہے کشتری کی ہاں سے آگے جب طفیل صاحب کا گھر آگیا ——— اور جب ہم اپنے گھر پہنچے تو شب کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

صدرِ پاکستان کی طرف سے دعوت

بھارتی وفد دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز سیدھے کراچی روانہ ہوا تھا کراچی سے اسلام آباد اور پھر لاہور پہنچا تھا انہیں دنوں ایران کے صدر خمینی پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے پاکستان کے صدر جناب ضیاء الحق بے حد مصروف ہونے کے باعث بھارتی ادیبوں کے وفد سے اسلام آباد میں مل نہیں سکے تھے۔ صدر خمینی کے پاکستان سے روانہ ہونے کے بعد صدر ضیاء الحق صاحب نے بھارتی وفد سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور میں نہایت پُر تکلف دعوت دی گئی۔ اس ادبی اجتماع میں بھی پاکستان کے بہت سے ادیبوں کو خاص طور سے مدعو کیا گیا تھا بے شک یہ ایک رسمی اجتماع تھا لیکن پاکستان کے صدر کی موجودگی میں بھی ماحول بالکل غیر رسمی تھا۔ صدر ضیا صاحب کے

حوالے سے چند باتوں کا ذکر یہاں کتنا مناسب ہوگا ملاقات وہ ادیبوں شاعروں اور دانش وروں میں کافی مقبول ہیں ایسے تمام لوگوں سے اُن کی ذاتی پہچان ہے وہ بے حد ملنسار اور خوش مزاج ہیں ان کی شخصیت کے ایسے کئی اوصاف اس تقریب میں کھل کر سامنے آگئے تھے وہ ہر کسی سے خصوصاً بھارتی ادیبوں کے وفد کے اراکین سے بغل گیر ہوتے رہے اور شروع سے آخر تک اس تقریب میں حاضر رہے۔

تقریب میں پہلے لیستری رحمٰن، کنور مہیندر سنگھ بیدی اور پھر صدر پاکستان جناب ضیاء الحق نے تقریریں کیں۔ لیستری رحمٰن کو لکھنے اور پیاری پیاری باتیں کرنے کا فن ہی نہیں آتا، تقریر کرنے کا فن بھی آتا ہے انھوں نے بھارتی ادیبوں کی پاکستان آمد کو ایک نہایت خوش گوار ادبی واقعہ قرار دیا اور کہا کہ ادیب دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان بہتر اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے میں ایک پل کا کام کر سکتے ہیں۔ صدر ضیاء نے اپنی تقریر میں لفظ بلفظ وہی باتیں دہرائیں جو لیستری رحمٰن نے اپنی تقریر میں کہی تھیں۔ ایک خاص بات انھوں نے کنور بیدی صاحب کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی کہی کہ آئندہ جب بھی وہ بھارت آئیں گے تو بیدی صاحب کے ساتھ کھانا کھائیں گے کنور مہیندر سنگھ بیدی صاحب نے اس موقع پر نعت پڑھی اور اس نے پناہ محبت کا ذکر کیا جو انھیں اور ان کے وفد کے اراکین کو پاکستان میں میسر ہوئی انھوں نے امید ظاہر کی کہ دونوں ملکوں میں بہت جلد خوش گوار اور دوستانہ ماحول پیدا ہو سکے گا اور اس ماحول کو پیدا کرنے میں دونوں ملکوں کے ادیب اپنی ذمہ داری کو بخوبی سمجھیں گے۔

اگلے روز بھارتی ادیبوں کا وفد بذریعہ ہوائی جہاز لاہور ہوتا ہوا دہلی کے لیے روانہ ہوگیا۔ اور میں پاکستان میں رہ گیا پاکستان میں اپنے تجربات، مشاہدات، تقریبات اور بہت سی دوسری باتوں کا ذکر کرنے سے پہلے میں چند اُن خاص باتوں کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کا تعلق بھارتی وفد کے ساتھ ہے۔

پاکستان میں بھارتی ادیبوں کے وفد کی سرگرمیاں

پاکستان میں بھارتی ادیبوں کے وفد کی آمد اور ان کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں پاکستان کے اُردو اخبارات میں خاص طور سے بہت چرچا ہوتا رہا وہاں لاہور، اسلام آباد، راولپنڈی، کراچی سے بیک وقت شائع ہونے والے اُردو اخبارات کی تعداد کافی ہے۔ بہت سے مقامی پرچے بھی شائع ہوتے ہیں لیکن جنگ، نوائے وقت، مشرق ـــــ تین ایسے بڑے روزنامے ہیں جن کی اشاعت نہ صرف بہت

حوب صورت و پُرکشش ہوتی ہے ملکہ کئی لاکھ کی تعداد میں چھپتے ہیں۔ روزنامہ جنگ اور نوائے وقت
لاشبہ ہر لحاظ سے پہلے درجے کے اخبار ہیں اور ہر میدان میں دونوں میں اوّلیت حاصل کرنے کا مقابلہ ہوتا
رہتا ہے۔ پاکستان میں بھارتی ادیبوں کے وفد کی آمد کے سلسلے میں بھی ان دونوں اخبارات میں پہل حاصل
کرنے کا مقابلہ ہوتا رہا۔

اس سلسلے میں پہل روزنامہ جنگ نے کی جب بھارتی وفد کو انھوں نے کراچی میں ہی اپنے دفتر میں
مدعو کرکے ان کے ساتھ مجلسِ مذاکرہ منعقد کر ڈالی اور پھر ۱۸ر جنوری کی اپنی اشاعت میں "ہندوستان میں
اُردو ادب" عنوان کے تحت دو مکمل صفحات پر نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ کنور مہیندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر جامد کاشمیری، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور دیگر اراکین کے علاوہ
اس خصوصی اشاعت میں پاکستان کے چیدہ ممتاز ادیبوں کی بڑے سائز کی رنگین تصویریں بھی شاملِ
اشاعت کی گئیں جنھوں نے بھارتی ادیبوں کے ساتھ بات چیت میں شرکت کی تھی۔

مجلس میں اکرم

مجلسِ مذاکرہ میں بھارتی وفد کو خوش آمدید کہتے ہوئے روزنامہ "جنگ" کے چیف ایڈیٹر جناب میر
خلیل الرحمٰن نے بتایا کہ "جنگ" اخبار کی روزانہ اشاعت ساڑھے چھ لاکھ ہے۔ اسی ادارے کی طرف سے شائع
ہونے والے ہفتہ وار اخبار "اخبارِ جہاں" کی اشاعت ایک لاکھ ساٹھ ہزار ہے۔ اس کے علاوہ یہ ادارہ ایک
انگریزی ہفتہ وار میگ۔ اور شام کا روزنامہ انگریزی اخبار "ڈیلی نیوز" بھی شائع کرتا ہے جس کی اشاعت
بھی قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے آج کے دن کو "جنگ" کی تاریخ کا اہم ترین دن قرار دیتے ہوئے کہا کہ بھارت
کے بہت بڑے شاعر، ادیب، محقق اور دانشور ہمارے گھر تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ اگر
اسی طرح وفود کا تبادلہ ہوتا رہا تو دونوں ملکوں کے تعلقات کو بہتر بنانے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس
میں مزید کمی ہو جائے گی اور تعلقات جلد بہتر ہو جائیں گے۔ جو دُوریاں ہیں وہ کم ہو جائیں گی اور جو غلط
فہمیاں ہیں وہ دُور ہو جائیں گی۔

جناب تسیع عقیل صاحب نے مذاکرے کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ دونوں ملکوں کے درمیان سیاسی اور
اقتصادی سطح پر خوش گوار تعلقات قائم ہو رہے ہیں جب کہ ادبی سطح پر تو یہ پہلے ہی سے موجود ہیں۔ انھوں نے

مشہور شاعر، محقق، اور ادیب جناب مشفق خواجہ سے بات چیت شروع کرنے کو کہا اس تقریب میں پاکستان
کے مشہور ادیب ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ناحرہ منور، محمد علی صدیقی، جمال الطاہر اور شوکت صدیقی صاحب نے
بھی حصہ لیا اور مختلف ادبی موضوعات پر بھارتی ادیبوں سے کھل کر بات چیت کی۔ جو باتیں زیرِ بحث آئیں ان
میں ادبی تحقیق، شاعری اور نثر کے مختلف رجحانات اردو رسائل و ادب کی اشاعت اور مقبولیت وغیرہ موضوع
شامل تھے

ایوانِ وقت میں

اخبار نوائے وقت بھی پیچھے نہیں رہا بھارتی ادیبوں کا وفد جب لاہور پہنچا تو شام ڈھل رہی تھی لیکن
"نوائے وقت" کے ادبی ایڈیشن کے انچارج جناب عطاء الحق قاسمی شکل و صورت قلب و ذہن اور قلم سے نہایت
خوب صورت ذہن اور حاذق و جو مدتِ مدید کے ساہدار السان ہیں انھوں نے بھارتی وفد کو لاہور کے ہوائی اڈے پر
ہی موہ لیا اور اُسی رات وہ انہیں ایوانِ وقت میں لے جانے میں کامیاب ہوگئے اس مجلسِ مذاکرہ میں بھارتی ادیبوں
سے جن پاکستانی اہلِ قلم حضرات نے بات چیت کی اُن میں میزبان عطاء الحق قاسمی کے علاوہ جناب انتظار حسین، ڈاکٹر
سلیم اختر، منیر احمد شیخ، زاہد مسعود اور سراج منیر صاحب تھے۔ اس مجلسِ مذاکرہ کی تفصیل شریک قلم کاروں کی خوبصورت
رنگین تصویروں کے ساتھ "نوائے وقت" کی ۲۵ فروری کی اشاعت میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کی گئی تھی
چند سوال و جواب اس طرح تھے۔

عطاء الحق قاسمی: "بیدی صاحب! پاکستان کا موجودہ دورہ آپ کو کیسا لگا؟"

کنور مہیندر سنگھ بیدی: ہمیں ہر جگہ محبت، پیار اور خلوص ملا ہر جگہ ہمارے اور آپکے مذاکرے ہوئے جن
سے ہمارے علم میں اضافہ ہی ہوا ممکن ہے کہ آپ کچھ ہی باتیں ہم سے سُنی ہوں ان علمی مباحثوں کے علاوہ ہمیں
یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس وفد کا جو اثر لوگوں نے محسوس کیا ہے وہ یہ ہے کہ بھارت اور پاکستان کے لوگ
ایک دوسرے کے قریب آنے کی دلی خواہش رکھتے ہیں ہمارا یہاں آنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔"

عطاء الحق قاسمی: "کیا سیاسی معاملات میں ادب بھی کوئی رول ادا کر سکتا ہے؟"

بیدی صاحب: آپ سب جانتے ہیں کہ ادب نے ہر زمانے میں قوموں کی تشکیل میں، زبان کے ارتقا میں
اہم کردار ادا کیا ہے۔ ادب برائے ادب اور برائے سیاست بھی ہوتا ہے ہم برائے سیاست کے تو قائل

نہیں ہیں ہم تو سیدھے سادے لکھنے لکھانے والے ہیں ادب جہاں برائے ادب ہو رہا ہے وہاں رہا سوچتی ہے اور پھولتی پھلتی ہے اور جہاں ادب محبت کا پیغام دے تو آپس میں رفاقت، ہمسائیگی، یک جہتی مروت اور تمام چیزوں کے بڑھنے میں مدد دیتا ہے۔"

سراج منیر: "ایک عام تاثر یہ ہے کہ ادبی رسالوں کا پاکستان اور بھارت کے درمیان تبادلہ کچھ بہت زیادہ تسلسل کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس سے دونوں ملکوں پر کسی درجہ یہ احساس ضرور ہے کہ اس طرح کا تبادلہ نہ ہونے سے کچھ رجحانات جو کسی زمانہ میں ایک جہت میں تھے ان میں کچھ فاصلے پیدا ہو گئے ہیں۔"

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ: "کتابوں کے بارے میں تاثر یہ ہے کہ دونوں ممالک کے رسالے کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے ملک میں پہنچ جاتے ہیں اور دونوں ملک کے لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اگرچہ ان کا کھلا تبادلہ ہونا چاہئے۔ وہ نہیں ہے حال ہی میں بھارت کا جو معاہدہ ہوا ہے اس میں کتابیں بھی شامل ہیں اب اگر کتابوں کی آمد و رفت بالکل کھول دی جائے تو بہت اچھا ہوگا قابل اعتراض لٹریچر کے بارے میں تو ہر ملک کو حق حاصل ہے کہ وہ اس پر پابندی لگائے اور اپنے ملک میں نہ آنے دے۔"

سراج احمد تنویر: جب بھارت سے ادیبوں اور دانشوروں کا کوئی وفد پاکستان آتا ہے تو بعض لوگوں کے ذہن میں جو سوال فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں تو ان میں سے پہلا سوال یہ ہے کہ اُردو زبان اور ادب بھارت میں تقسیم کے بعد کافی لکھا گیا بلاشبہ تخلیق اور تحقیق کے میدان میں کافی کام ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود یہ احساس ہوتا ہے کہ اُردو زبان وہاں ایک بہاؤ ہی عمل کا حصہ نہیں بن سکی جیسا کہ ہمارے یہاں یہ تقریباً اور پڑھا بھی جا رہی ہے لیکن میں مانتا ہوں کہ ابھی تک ہم اس کو قومی زبان کے طور پر اس مرحلہ تک نہیں پہنچا سکے جس پر اسے ہونا چاہیے لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر گھر میں اردو اور انگریزی کا اخبار آئے تو ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ اُردو کا اخبار پہلے پڑھیں بہرحال ایک ایسی کوشش جو وہاں اُردو کے لیے تحریک کے طور پر ہو رہی ہے وہ کس حد تک موثر ہو سکے گی اور دونوں ملکوں کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کر سکے گی اور وہاں اُردو کے لیے جو کام ہو رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟"

سیدی صاحب: "میں سو فی صدی مطمئن نہیں ہوں لیکن آج سے ۲۵ ۔ ۳ سال پہلے جو حالات تھے ہم ان سے نکل کر اور سنبھل کر ایک صحیح راستے کی جانب چل پڑے ہیں مرحلہ ہماری نگاہ میں ہے اور ہماری حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اب اُردو پر کروڑوں روپے خرچ ہو رہے ہیں ہماری اکادمیوں کا بجٹ

میں سے تیس کروڑ روپے کا ہے۔ بہت سے دوسرے ادارے بھی ہیں جو اُردو کے لیے کام کر رہے ہیں بھارت میں اُردو کے بے شمار اخبار اور رسالے شائع ہوتے ہیں"

عطاء الحق قاسمی : ان کے پڑھنے والے بھی ہیں یا نہیں ؟"

سیدی صاحب : کوئی اخبار بغیر ریڈر کے نہیں چل سکتا میری غرض تو یہ ہے کہ ہم سو فی صد مطمئن نہیں ہیں لیکن ہم اس بات سے مطمئن ہیں کہ ہم نے اب سدھار سے شروع کیا ہے آج سے کچھ عرصہ قبل ہماری حکومت میں اُردو کے خلاف جو جذبہ تھا وہ ہم ختم کر چکے ہیں اب آپ یہ دیکھیں کہ بولنے والی زبان اور لکھنے والی زبان میں فرق ہوتا ہے ہندوستان میں دیہات کی بولیاں ایسی ہیں کہ وہ علاقائی زبان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں لیکن وہاں عام طور پر جو زبان بولی جاتی ہے وہ سیدھی سی اُردو ہوتی ہے"

اس مذاکرے میں اُردو ادب اور زبان کے مختلف پہلوؤں پر بہت کھل کر بات چیت ہوئی جس میں علمی، تحقیقی اور ادب کے حوالے سے تکنیکی موضوعات بھی شامل تھے علاوہ ازیں بھارتی وفد کی رکن اور بھارت میں اردو پروموشن بیورو کی ڈائریکٹر ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے تفصیل سے بتایا کہ اس وقت بھارت میں عملی طور پر اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کیا کام ہو رہا ہے۔

پاکستان میں بھارتی وفد کے قیام اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں بہت سے کالم نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں بہت کچھ لکھا کل ملا کر یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ ادیب اور دانشور بھارتی ادیبوں کے دورہ پاکستان کو دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات استوار اور خوش گوار بنانے میں ایک اچھا قدم قرار دے رہے ہیں

جب بھی آتا ہے میرا نام ....!

۱۸ جنوری کو بعد دوپہر بھارتی ادیبوں کا وفد بذریعہ ہوائی جہاز دہلی کے لیے روانہ ہو گیا تھا اب میں اکیلا لاہور میں تھا اور میرے ادبی سفر کا نیا سلسلہ شروع ہوا تھا۔

قتیل شفائی کے گھر دعوت

برصغیر کے ممتاز اُردو شاعر جناب قتیل شفائی سے یوں بھی میری بات چیت ہو چکی تھی اور ان کے گھر پر رات کے کھانے کی دعوت میں قبول کر چکا تھا جناب قتیل شفائی کا نام ذہن میں آتے ہی اُنھیں کا ایک شعر میرے ذہن میں

میں آجاتا ہے ؎

جب بھی آتا ہے میرا نام ترے نام کے ساتھ　　جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں

معلوم نہیں کہ قتیل نے یہ شعر کب اور کس جذبے کے تحت لکھا تھا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اُردو شاعری میں قتیل کے مقام کا ذکر جب بھی ہوتا ہے تو بہت سے لوگ تلملاتے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ قتیل کے فن کی بلندیوں نے اُن کی بے پناہ مقبولیت سے جلتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے یہ الفاظ بہت صحیح ہیں کہ تعروفن کے بیشتر نقادوں نے قتیل کے ساتھ ہمیشہ تعصب برتا ہے لیکن قتیل نے ان تمام باتوں سے بے پرواہ ہو کر لکھا ہے، بہت خوب لکھا ہے اور بہت نام کمایا ہے۔ اُن کی باریک خیالی، زندگی سے والہانہ محبت، انسان دوستی اور فن پر مضبوط گرفت ان کی ہر تخلیق میں اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ وہ اُردو کے ایسے البیلے شاعروں میں سے ہیں جن کے نغموں کی جھنکار من کو موہ لیتی ہے لیے لہجے وہ ایک الگ پہچان کے مالک ہیں۔ اُن کی آواز میں السارس اور لوچ ہے جس نے گیت اور نظم کے فاصلے کو مٹا دیا ہے۔ قتیل غزل اور گیت کا ایک بڑا شاعر ہے۔ ان کی غزلوں میں غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کا بھرپور احساس ملتا ہے۔ انھوں نے غزل کے مزاج اور آہنگ کو مجروح نہیں ہونے دیا اور ہندی کے بہت سے عام الفاظ کا جن، لاج، روپ، گھور اندھیرا، رس، کویل وغیرہ کو اپنی غزلوں میں اس انداز سے استعمال کیا ہے کہ کہیں اجنبیت محسوس نہیں ہوتی اور نہ ہی اُن کی لطافت میں کمی آتی ہے۔ اسی طرح غزل کا حسن اور رعنائی ان کی نظموں میں بھی نمایاں ہے۔ قتیل دل میں گہرائیوں تک اُتر جانے والی خوب صورت اور سادہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کے لہجے میں نغمگی، سرمستی اور سرشاری ہوتی ہے۔ اسلوب میں شائستگی، لطافت اور روانی ہوتی ہے۔

یہاں میرا مقصد قتیل شفائی کے فن پر کوئی مقالہ لکھنا نہیں ہے۔ میں شاعر نہیں ہوں اور نہ ہی نقاد، لیکن جب قتیل شفائی کا ذکر آتا تو اُن کے فن پر میرے ذہن کے تاثرات کا اُمڈ آنا ایک قدرتی بات ہے۔ اسی ضمن میں ایک اور بات کہوں گا۔ اکثر لوگ ادب اور فلم کو الگ الگ نقطۂ نگاہ سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ جب کوئی شاعر کسی فلم کے لیے گیت لکھتا ہے تو بعض نقاد حضرات اُس شاعر کی فلم سے وابستگی کو صحت مند انداز میں نہیں دیکھتے۔ ایک حد تک وہ غلط نہیں ہوتے کیوں کہ ہماری فلموں میں خواہ وہ بھارتی فلمیں ہوں یا پاکستانی، جیسے گیت سننے کو ملتے ہیں ادب اور فن کے معیار سے وہ کوسوں دُور ہوتے ہیں۔ قتیل شفائی فلم کا شاعر بھی ہے۔ پاکستانی فلموں کے لیے بے شمار گیت انھوں نے لکھے ہیں بعض ہندوستانی فلموں کے لیے بھی لکھا ہے اور فلموں کے ذریعے بھی عوام کے دلوں میں انھوں نے گھر کیا ہے لیکن اُن کے ادبی اور فنی معیار میں کہیں بھی کوئی کمی نہیں آئی۔ وہاں بھی وہ ایک

مکمل ادبی سائرس کر اُبھرے ہیں فنی اعتبار سے یہ ایک بڑی اور اہم بات ہے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ قتیل شفائی صاحب کے گھر مجھے رات کے کھانے کی دعوت پر جانا تھا طے ہوا تھا کہ میں شام چھ بجے پہنچ جاؤں یا پانچ بجے میں گنتری رتن کے ساتھ بھارتی ادیبوں کے وفد کو وداع کر کے لاہور ہوائی اڈے سے گھر پہنچا تھا اور چھ بجے قتیل شفائی صاحب کے یہاں پہنچ گیا تھا۔

قتیل میرے لیے اجنبی نہیں تھے اُن سے میری ملاقات ۱۹۸۲ء میں ماہنامہ شمع "نئی دہلی کے دفتر میں ہوئی تھی اور اس کے بعد اُن سے برابر خط و کتابت ہوتی رہی تھی۔ میری گاڑی رکنے کی آواز سنتے ہی وہ گھر سے باہر آگئے۔ بڑے پیار اور گرم جوشی سے ملے اور بغل گیر ہو گئے۔ چند لمحوں کے بعد میں اور وہ ڈرائنگ روم میں تھے۔ میرا خیال تھا کہ انھوں نے کھانے پر چند اور دوستوں کو بھی بلایا ہوگا لیکن یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ وہاں کوئی اور نہیں تھا تسلی اس لیے ہوئی کہ بہت سے لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں بہت سی باتیں نہیں ہو تیں اور ملاقات محض ایک رسمی سی بات ہو کر رہ جاتی ہے۔ قتیل شفائی جیسے پیارے دوست سے بلا تکلف اور پیاری پیاری باتیں کرنے کا لالچ بھلا کیسے نہیں ہوگا۔

حسن صورت ڈرائنگ روم میں میں تھا، قتیل تھے اور گھر کے افراد تھے۔ گھنٹہ بھر آپس میں ذاتی باتیں ہوتی رہیں۔ وطن اور وطن کے لوگوں کی باتیں ہوتی رہیں کنور مہیندر سنگھ بیدی، جگن ناتھ آزاد، کرشن ادیب، ساحر ہوشیارپوری اور بھارتی فلم اسٹار منوج کمار کے علاوہ کئی دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ قتیل کا اوڑھنا بچھونا اور روٹی روزی ادب ہی ہے وہ فلموں کے لیے گیت لکھتے ہیں اور فلم ساز بھی ہیں اس ضمن میں وہ اپنے تجربے بیان کرتے رہے ساحر لدھیانوی کی فلمی شاعری اور ادبی شاعری کا ذکر ہوا۔ بھارت اور پاکستان کی فلمی صنعت کا ذکر ہوا پہلی بار مجھے علم ہوا کہ اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں قتیل نے افسانہ نگاری بھی کی ہے لیکن بعد میں وہ شاعری کی طرف مائل ہو گئے اور اب صرف ایک شاعر کی حیثیت سے ہی اُن کی پہچان ہے اور کئی مختلف موضوعات بھی زیر بحث آئے اور میں نے محسوس کیا کہ قتیل نہ صرف ایک مکمل اور بھرپور انسان ہیں بلکہ اپنے آپ میں ایک انجمن ہیں۔

قتیل کے تین بیٹوں میں نوید قتیل سب سے چھوٹا ہے اور موسیقی اس کا بہترین مشغلہ ہے بطور گلوکار ریڈیو ٹی وی اور دیگر ایسے مختلف پروگراموں میں پُر اثر شرکت کے باعث اس نے ابتدائی طور پر اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ خوبصورت شخصیت کی طرح اُس کی آواز میں بھی خوبصورتی اور مکمل نغمگی ہے آج ہی کے دن اُس کی پہلی آڈیو کیسٹ

ریلیز ہوئی تھی اور اُس کی خوشی میں شرکت کرتے ہوئے ہم لوگوں نے اس کی گائی ہوئی غزلوں کا بھرپور لطف حاصل کیا۔

آمد مرتضیٰ برلاس کی

ساڑھے سات بجے کے قریب کال بیل کی مترنم آواز پیدا ہوئی تو قتیل نے کہا کہ شاید وہ لوگ آ گئے ہیں
مَیں نے سوالیہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا تو کہنے لگے کہ حیدر جامی دوستوں کو بھی کھانے پر بلایا ہے تبھی لمبے قد کے صحت مند
اور ادھیڑ عمر کے ایک صاحب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے قتیل صاحب نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آپ مرتضیٰ برلاس
ہیں۔ اُردو کے بہت اچھے شاعر ہیں، بڑے پیارے دوست ہیں۔ حیدر ور قتیل تک سرگودھا میں ڈپٹی کمشنر تھے
لیکن اب لاہور آ گئے ہیں اور ان کا عہدہ ڈپٹی ڈائریکٹر اینٹی کورپشن ہے میرے ملنے میں قتیل شاید انھیں پہلے ہی
بتا چکے تھے بات چیت کا سلسلہ جو ان کی آمد سے ملتوی ہو گیا تھا پھر سے شروع ہو گیا اُن کی پُرمزاح اور پُرلطف
باتوں کا مزا لیتے ہوئے مَیں نے از راہِ مذاق کہا

"آپ کے نام کے آگے جو سرکاری لقب ہے وہ کچھ عجیب سا لگتا ہے"

"کیوں؟" ذرا سی سنجیدگی سے انھوں نے پوچھا۔

"ڈپٹی ڈائریکٹر اینٹی کورپشن کی جگہ صرف کورپشن ہونا چاہیئے" سبھی کھلکھلا کر ہنس دیے اور بات چیت کا
رُخ کورپشن کے مسئلے کی طرف مُڑ گیا۔ بہت کھُل کر باتیں ہوئیں اور یہ راز مجھ پر پہلی بار افشا ہوا کہ بھارت کی طرح
پاکستان بھی بُری طرح سے اس مسئلے کا شکار ہے سماجی، تہذیبی، معاشی، سیاسی ——— غرضیکہ زندگی کے
ہر شعبے میں یہاں تک کہ ادب میں کورپشن کا زہر جڑوں تک سرایت کر گیا ہے اور حکومت اس بُرائی کو ختم کرنے کی
ہر ممکن کوشش کر رہی ہے پاکستان میں برسوں فوجی حکومت اور مارشل لا رائج رہا ہے۔ وہاں کے اسلامی نظام
اور قوانین کے تحت سخت ترین سزائیں تجویز ہیں لیکن کورپشن کا مسئلہ ویسے کا ویسا ہے بلکہ دن بدن اس میں اضافہ
ہو رہا ہے۔

مرتضیٰ برلاس صاحب کا تعلق مراد آباد (بھارت) سے ہے تقسیم وطن کے بعد بھی ۱۹۵۶ء تک وہ بھارت
ہی میں رہے ایم۔ایس سی تک تعلیم بھی انھوں نے یہیں حاصل کی اور پھر وہ پاکستان چلے آئے جہاں انھوں نے
سرکاری ملازمت اختیار کر لی اُردو کے مشہور قلم کار شمس کنول اور کیلاش ماہر ان کے ہم جماعت تھے اور بچپن سے

سوانی تک اپنی زندگی کے حسین لمحوں کے خواب یادوں کی شکل میں لیے دل و دماغ میں بسائے ہوئے ہیں۔ بیتے ہوئے کل کی ایسی یادوں میں کھو کر جب باتیں کر رہے تھے تو نمی اُن کی آنکھوں میں بھی دیکھی تھی ـــــ اُن کی آواز میں ایک تڑپ سی محسوس کی تھی۔ ایسی مٹی سے محبت کا جذبہ بڑا ہی مبارک ہوتا ہے ـــــ بڑا ہی تقدس اور عظیم ہوتا ہے۔

انتظار افسانہ نگار اے۔ حمید کا

نمی کسی کا نوں آیا اور بعد میں قتیل صاحب نے بتایا کہ انھوں نے تو معروف کے نامور افسانہ اور ناول نگار اے حمید اور شاعر احمد اسلام امجد کو بھی دعوت میں شرکت کا پیغام بھیجا تھا لیکن وہ دونوں ہی کہیں جا چکے تھے شاید انھیں پیغام نہیں ملا تھا اور یا شاید اُن کی کوئی ایسی مصروفیت رہی ہوگی کہ وہ ہمارے ساتھ شریک نہیں ہو سکے۔ دراصل قتیل شفائی بھی کئی دنوں تک لاہور سے باہر رہنے کے بعد رات ہی لوٹے تھے ورنہ ان کی خواہش تھی کہ آج کی اس محفل میں کچھ اور لوگوں کو بھی مدعو کیا جاتا۔ اے حمید کے قلم کا میں مداح ہوں اُنھیں جب جب بھی میں نے پڑھا ہے' اُن سے ہمیشہ متاثر ہوا ہوں۔ میں جب کبھی بھی دہلی جاتا تو اپنے عزیز دوست پرکاش پنڈت سے طویل ملاقات رہتی اپنی آمد کی اطلاع اگر میں نہیں دیتا یا کسی وجہ سے بغیر ملے ہی آجاتا تو مجھے کوئی علم ہوتا کہ پتہ لگتے ہی فون پر جملے اور یا پھر اگلی دفعہ ملاقات ہونے پر وہ بہت ور ری گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتا، عورتوں کی طرح ناراض بھی ہو جاتا اور پھر ذرا سی محبت اور مصنوعی خوشامد سے وہ نارمل ہو کر اے۔ حمید کے قصّے چھیڑ دیتا پرکاش پنڈت اے حمید کا بہت گہرا دوست تھا اگرچہ کبھی میں اے حمید سے نہیں ملا تھا، کبھی خطوط کا تبادلہ بھی نہیں ہوا تھا لیکن اس سب کے باوجود پرکاش پنڈت کی باتوں کے توسط سے اُن سے میری یک طرفہ گہری دوستی ہو گئی تھی یا اس محبت کا زبردست احساس پیدا ہو گیا تھا جو دوستی کی بنیاد ہوتی ہے قتیل کی دعوت میں اے حمید کے موجود نہ ہونے سے مجھے مایوسی کا احساس ہوا اسی طرح امجد اسلام امجد سے ملنے کی بھی میری چاہ تھی لیکن میں مایوس نہیں تھا کیوں کہ پاکستان میں ابھی کچھ دن اور میرا قیام تھا اور امید تھی کہ میں انھیں کہیں نہ کہیں ڈھونڈ ہی لوں گا۔ ہوٹل ہالیڈے کی سرکاری تقریب میں امجد سے میری ملاقات ہوئی ضرور تھی لیکن تشنگی باقی تھی ـــــ مفصل گفتگو کی تمنا تھی۔

قصّہ مہمان نوازی کا

اب ہم لوگ کھانے کی میز پر تھے پاکستانی مہمان نوازی دُنیا بھر میں مشہور ہے یہی بات قتیل کے یہاں

دیکھئے کوملِ رہی تھی بڑے ڈائیننگ ٹیبل کے گرد ہم لوگوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ان پکوانوں کی تعداد تھی جو گھر میں ہی سامنے گئے تھے کئی طرح کا گوشت تھا سبزیاں تھیں دال، دہی بڑے اور خاص بات یہ کہ آلو وڑی کی ترکاری بھی تھی اور ہر پکوان ایک سے زیادہ لذیذ تھا۔ دہی بڑے جنھیں ہم بھارتی پنجاب میں "دہی بھلے" کہتے ہیں اور آلو وڑی پنجاب بلکہ خصوصاً امرتسر کے لوگوں کا من بھاتا کھاجا ہے، پاکستان میں کم ہی ملتا ہے شاید اس کی وجہ وہاں کے لوگوں کا گوشت خور ہونا ہے۔ میرے پوچھنے پر قتیل نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا انھوں نے کہا کہ چند برس قبل ایک سکھ پریوار لاہور آیا تھا اُن سے جان پہچان کسی اور کے حوالے سے تھی وہ لوگ ہم سے ملنے آئے تو انھیں ہم نے روک کر اپنا مہمان بنالیا اور اس کا فائدہ یہیں یہ ہوا کہ ہماری رسوئی مکمل طور پر بھارتی پنجاب کے کھانوں کی مہک سے معطر ہو اٹھی ہمارے گھر میں گوشت سے زیادہ سبزی اور ترکاری پکتی ہے اور یہ ہمیں اس سکھ پریوار نے سکھایا ہے۔ یا پڑ وڑیاں یہاں تو ملتی نہیں پنجاب یا امرتسر سے اگر کوئی دوست یہاں آتا ہے تو وہیں سے یہ تحفہ ہمارے لیے لے آتا ہے۔

کھانے کے بعد چائے اور چائے کے ساتھ قتیل اور مرزا صاحب کی جدید غزلیں اور نظمیں سننے کا لطف حاصل کیا خوش گوار ماحول میں بھیگتے ان لمحوں کا لطف نصف شب تک حاصل ہوتا رہا۔ پھر ملنے کا وعدہ کر کے ہم لوگ قتیل کے ہاں سے وداع ہوئے۔

قتیل شفائی کی مہمان نوازی کا ایک واقعہ اور شاد و الحسن کا ذکر "نقوش" کے مدیر جناب محمد طفیل نے اپنی کتاب "محترم" میں کچھ یوں کیا ہے۔

"مجھے فارغ بخاری صاحب نے بتایا کسی اور نے کہ ایک زمانے میں کہ جب ان دنوں قتیل شفائی کی فاقہ مستی کے دن تھے مقروض بھی تھے کہ فارغ بخاری صاحب ان کے گاؤں ہری پور ہزارہ پہنچے ادھر ان کی جیب خالی تھی قرض دینے والا بھی کوئی نہیں تھا چاہیے پریشان ہوئے انھوں نے جب دیکھا کہ چند روپے بھی کہیں سے میسر نہ آ سکیں گے تو ــــــ رسالوں کی فائلیں ردی میں بیچ دیں۔ وہ رسالے جو انھوں نے بڑے چاؤ سے اکٹھے کر رکھے تھے ردی ٹکا ٹک گئے۔ وہیں کی دنیا اُلٹ گئی، دل کی دنیا آباد ہو گئی"

مہمان نوازی کا یہ جذبہ جس میں اپنے کو مٹا کر بھی لطف اندوز ہوا جاتا ہے، بڑا قیمتی بھی ہے اور نایاب بھی۔ بھلا ہر کس و ناکس کے حصے میں یہ دولت کہاں سے آ سکتی ہے شاید اس دولت سے مالا مال آدمی ایک قتیل شفائی

ہی ہو سکتا ہے ـــــ اور وہ پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔

نستری رحمٰن۔ میں اور میاں رحمٰن

آج اتوار کا دن تھا

بھارت میں اتوار کا دن چھٹی کا دن ہوتا ہے لیکن پاکستان میں چھٹی کا دن جمعہ یعنی شکروار ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی شاید صدرِ مملکت جناب ضیاءالحق کے عہدِ حکومت میں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس دن کا اہم ہونا ہے لوگ مسجدوں میں نماز ادا کرتے ہیں اور دیگر مذہبی فریضے سرانجام دیتے ہیں ہمارے ہاں اتوار کی طرح پاکستان بھر میں جمعہ کے روز دفاتر اور کاروباری ادارے بند ہوتے ہیں۔

معمول کے مطابق صبح اٹھ کر جب میں تیار ہو چکا تو آج کے اخباروں کے ساتھ نسری میرے کمرے میں آگئی۔

"کیول بھائی، آپ نے اپنے گھر خط لکھا کہ نہیں؟" کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کا پہلا سوال تھا ـــــ

"شاید نہیں لکھا ہو گا ـــــ وقت ہی کہاں ملا!" اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں، انھوں نے کئی سارے ڈاک لفافے میرے ہاتھ میں تھما دیے اور تاکید کی کہ سب سے پہلا کام یہی کروں۔ "بھائی اور بچے فکرمند ہوں گے اور ہاں! دُھلائی کے لیے کپڑے نکال دیں تھوڑی دیر میں دھوبی آکر لے جائے گا ـــــ خط لکھنے کے لیے پیڈ اور لوٹ بک میں بھجوا دیتی ہوں ـــــ رحمٰن بھی گھر پر ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ناشتہ ہم لوگ ساتھ ہی کریں گے ـــــ آج پاکستان ٹی۔ وی کے لیے ایک ریکارڈنگ کا پروگرام بھی طے ہوا ہے۔ ریکارڈنگ کے لیے کیمرہ ٹیم گھر پر ہی آ رہی ہے ـــــ ڈرائیں بھی تیار ہو لوں۔ باقی سب باتیں بعد میں کریں گے ـــــ"

نسری اتنی ساری باتیں ایک ہی سانس میں کہہ گئیں اور پھر مسکراتی ہوئی میرے کمرے سے چلی گئیں کسی ایک بھی بات کا جواب دینے کا موقع ہی انھوں نے نہیں دیا۔ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ میں یہاں اجنبی نہیں ہوں مہمان بھی نہیں ہوں ـــــ جیسے اسی گھر کا ایک فرد ہوں نسری کی ہر بات میں پیار تھا، اپنے پن کا احساس تھا۔ اور ایک ایسے احساس کی ذمہ داری بھی جو کسی بھی گھریلو کی عورت ناں ماں میں فطری طور پر ہوتی ہے۔

بھارت ایک بڑا دیش ہے

لدھیانہ میں اپنی شریک حیات کانتا کو، بیٹی بھارتی کو اور دہلی میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہے بیٹے

بیٹے اُن کو میں نے خطوط لکھے۔ بھارت میں بعض دوستوں کو بھی مختصر طور پر خطوط لکھے۔ اخبارات کی ورق گردانی کی
اور پھر ہم لوگ ناشتے کی میز پر جمع ہو گئے بیتے ہوئے کل کی باتیں ہوئیں۔ ادب اور ادیبوں کی باتیں ہوئیں۔
بھارت اور پاکستان کے درمیان پیدا ہو رہے دوستانہ اور خوش گوار ماحول کی باتیں ہوئیں میاں رحمٰن
صاحب جو ایک کاروباری آدمی ہیں، اس نقطۂ نگاہ سے دونوں ممالک کے درمیان بہتر تعلقات کے قیام کی ضرورت
پر بہت تفصیل سے بات چیت کی۔ رحمٰن صاحب نے قبول کیا کہ بھارت ایک بڑا دیش ہے، وہاں ہر میدان میں
قابلِ قدر ترقی ہوئی ہے۔ خاص طور سے صنعت کے شعبے میں بھارت نے بہت تیزی سے ترقی کی ہے جبکہ
اس میدان میں پاکستان کی ترقی کی رفتار کافی مدھم ہے بھارت میں صنعتی پیداوار کے بہت بڑے بڑے
ایسے پراجیکٹ ہیں جن کے قیام میں سوویت روس نے تکنیکی لحاظ سے بہت مدد کی ہے۔ رحمٰن صاحب کا خیال تھا
کہ صنعت کے ان مختلف شعبوں میں بھارت خود کفیل ہو رہا ہے اور شاید عنقریب ہی وہاں صنعتی پیداوار اتنی
بڑھ جائے گی کہ برآمدات کے لیے اُسے منڈیوں کی ضرورت ہو گی۔ اُن کا خیال تھا کہ بھارتی صنعت کار یا ایشیائی
ممالک کے صنعت کار جو مال تیار کرتے ہیں ابھی وہ یورپ کی منڈیوں میں بڑے ممالک کی صنعتی اشیا سے مقابلہ نہیں
کر سکتے اس لیے لازمی ہے کہ بھارت اور پاکستان میں زیادہ سے زیادہ بہتر تعلقات قائم ہوں تاکہ خاص طور
سے دونوں دیشوں اور عام طور سے ایشیائی اور افریقی ممالک میں صنعت کا فروغ ہو۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ
ہمارے درمیان روایتی، تہذیبی، سماجی اور معاشی اشتراک ہم دونوں کے لیے سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔
کیوں کہ ان تمام شعبوں میں ہم پہلے سے ہی ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ رحمٰن صاحب کی سنجیدہ
باتوں میں نہ صرف وزن تھا بلکہ کاروباری سوجھ اور دوستی کے جذبوں کی گرمی بھی تھی میں نے ان دنوں
دونوں دیشوں کے درمیان چل رہے مذاکرات اور طے پائے ایک تجارتی معاہدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
کہا کہ دھیرے دھیرے ہم اسی جانب آگے بڑھ رہے ہیں غلط فہمیاں بہت سی ہیں، عالمی سیاست کو بھی دخل حاصل
ہے لیکن اس سب کے باوجود دونوں دیشوں کے سربراہ بھی سنجیدہ، سلجھے ہوئے اور مخلص انسان ہیں اس لیے زیادہ
سے زیادہ بہتری کی امید کی جانی چاہیے

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا

مسٹر رحمٰن نے بات چیت میں شریک ہوتے ہوئے کہا کہ بھارت بڑا بھائی ہے اور پاکستان چھوٹا

بھائی بھارت کو بڑے بھائی کی ذمہ داری سنبھالنی چاہیئے انھوں نے گزشتہ دنوں اپنے بھارت کے دورے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب اُن کی ملاقات بھارت کے راشٹر پتی گیانی ذیل سنگھ سے ہوئی تو میں نے یہی بات انھیں کہی تھی اُور یہ بھی کہ :

" تیرے سامنے بیٹھ کے رونا ــ ے دُکھ وی تینوں ہی دسنا "

بُشریٰ نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی کہ مُسکانوں کی سرسوں کھِل اُٹھی بات چیت کا رُخ بدل کر بشریٰ کے بھارتی دَورے کی طرف مڑ گیا۔ پردھان منتری راجیو گاندھی سے ہوئی ملاقات راشٹرپتی بھون کے مغل گارڈن کی خوب صورتی، کناٹ پلیس نئی دہلی کی گہما گہمی بھارت میں جمہوری آزادی، "شمع" کے مدیر یونس دہلوی کی ہلکی پھلکی پُرمزاح گفتگو، روزنامہ "ہندی اخبار" سماچار کیسری (نئی دہلی) کے ایڈیٹر اور مشہور اخبار نویس مرحوم رمیش جی کے لڑکے اشونی مِنا سے ہوئی ملاقات بھارت اور پاکستان کی عورتوں کے حُسن کا موازنہ ـــــ اور نہ جانے نئی دہلی سے وابستہ کتنی یادوں کا ذکر بشریٰ نے کیا اسی دوران میاں رحمٰن صاحب تیار ہونے کے لیے اُٹھ گئے شاید انھیں کہیں جانا تھا ابھی اکادمی ادبیات پاکستان کے چیرمین جناب علامہ ربّانی آگرو تشریف لے آئے۔ وہ جلدی میں تھے، پھر بھی کچھ دیر اُن سے رسمی باتیں ہوئیں اور چلتے وقت انھوں نے مجھے راولپنڈی آنے کی دعوت دی

آج کا میرا کوئی طے شدہ پروگرام نہیں تھا بشریٰ رحمٰن کو ایک سرکاری میٹنگ کے سلسلے میں کہیں جانا تھا مجھے چند اُن پاکستانی دوستوں سے ملنا تھا جن کے لیے میں بھارتی دوستوں کے پیغام لے کر آیا تھا۔ لاہور دیکھنے اور گھومنے کی تمنّا بھی تھی میرے خاندان کے کئی افراد کا تعلق لاہور سے رہا ہے اس شہر نگاراں کے قصے اُن سے سُنے ہیں اس لیے آج کا پروگرام میں نے اسے طور پر وضع کر لیا۔

رنگینیوں کا زندہ دل شہر لاہور

ابھی دن بھر کی مصروفیات سے قبل آیئے لاہور کی باتیں کریں۔ عظیم سرور نے حوالے سے اس شہر کا ذکر کچھ یوں ہے۔

" لاہور محض ایک شہر ہی نہیں، ایک عکس ہے ـــــ لاہور شہر نگاراں ہے ـــــ لاہور رنگوں اور رنگینیوں کا ایک زندہ دل شہر ہے "

کہتے ہیں کہ ہر ممتاز شہر کا ایک دریا ہوتا ہے ــــــ لندن کا ٹیمز، پیرس کا سین، نیویارک کا ہڈسن واشنگٹن کا پوٹومیک، آگرے کا جمنا اور میونخ کا مار سب دریا اپنے اپنے شہر کے ساتھ صدیوں سے بہہ رہے ہیں لیکن لاہور کے دریا راوی کی ادا نرالی ہے۔ روٹھ کے دُور چلے جانے اور پھر جوش محبت میں پاس آجانے کی ادا اسی دریا کی ہے کبھی راوی شہر کی فصیل کے ساتھ ساتھ بہتا تھا پھر جب ایک بار روٹھ کر دُور گیا تو اہلِ لاہور نے اسے بُڈھا راوی کہنا شروع کر دیا مصر کے نیل اور یورپ کے نیلے ڈینیوب کا پانی نیلا نہیں لیکن لاہور کے حُسن میں اضافہ کرنے والے راوی کا پانی گلابی رنگ کا ہے ــــــ گلابی گلاب جیسا۔

اس شہر میں ہر چیز رنگین ہے۔ لاہوری دروازے پر مچھلی کھائیے تو سُرخ رنگ میں رنگی ہوئی ہوگی پیجئے تو معلوم ہو کہ دودھ کو گلابی رنگ میں رنگ دیا گیا ہے۔ مونگ پھلی یا چنے کھائیے تو وہ بھی لال شاید اس لیے کہ راوی جس شہر کا دریا ہے وہ رنگوں اور رنگینیوں کا شہر ہے بسنت کے موسم میں تو لاہور کا آسمان تک بسنتی رنگ کا ہو جاتا ہے بسنت کے دن پورا لاہور پتنگیں اُڑاتا ہے اور پتنگیں لُوٹتا ہے

ہر شہر کے نام کی ایک تاریخ ہوتی ہے اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے اس تاریخ پر کہانیوں کے پردے پڑتے جاتے ہیں اسی طرح کی ایک کہانی ہے کہ ایک تھا راجہ اس کے دو بیٹے تھے ایک بیٹے کا نام تھا "لا" دیا اور دوسرے نے "ہور" جب راجہ نے دونوں حصّوں کو جمع کیا تو "لاہور" بن گیا اور پھر یہی اس شہر کا نام بن گیا جسے بعد میں تاتاریوں نے کئی بار تاراج کیا ۷۰۳ ہجری میں یہ شہر مُلتان کے حاکم کے ماتحت تھا پھر ملتان کے حاکم نے کوئی خطا کی اور مُلتان لاہور کے حاکم کے ماتحت ہو گیا۔

لاہور تاریخی، جنگی، ثقافتی، ادبی، روحانی اور بستی شہر ہے اس شہر میں عالم اسلام کی سب سے بڑی مسجد بادشاہی مسجد کے نام سے موجود ہے یہ مسجد سادگی اور پرکاری کا ایک خوب صورت اور عمدہ نمونہ ہے بادشاہی مسجد عالمگیری مسجد بھی کہلاتی ہے کیوں کہ اسے مغل بادشاہ عالمگیر نے تعمیر کرایا تھا۔

لاہور کی پہلی مسجد ۹۱۲ ہجری میں سُلطان محمود غزنوی نے اپنی فتح کی یاد میں تعمیر کرائی تھی اس کے بعد یہاں سیکڑوں مسجدیں بنیں جن میں مسجد وزیر خان بھی شامل ہے اور کہتے ہیں کہ اسے رات بھر میں تعمیر کر دیا گیا تھا اور جس کے معماروں میں اقبال اور گاما پہلوان بھی شامل تھے اسی مسجد کے بارے میں اقبال کا یہ شعر ملاحظہ ہو ــ

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے ـ من اپنا پُرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

بادشاہ جہانگیر کا مقبرہ بھی لاہور میں واقع ہے پھولوں کے باغات میں گھری ہوئی اس عمارت میں چار مینار

ہیں اس مقبرے میں جائیں تو نور جہاں کی قبر بھی ملے گی جس پر نہ پھول ہوں گے نہ چراغ ــــــ یہ اُس ملکہ کے حکم کی وجہ سے ہے اور یہ حکم اب بھی چل رہا ہے۔ نور جہاں کا شعر ہے ؎

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے ــــــ نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

مغلوں کے دور میں لاہور کو مرکزی حیثیت حاصل تھی ہمایوں کے دور میں یہ شہر شورشتوں کی آماجگاہ رہا جہانگیر جب اکبر آیا تو اس نے پرانے قلعے کو پختہ کرایا اور لاہور میں شورشیں دب گئیں یہ قلعہ بعد میں بھی شورشتوں کو دبانے کے لیے ہی استعمال ہوتا رہا۔

لاہور پر مغلوں سے پہلے خلجی اور تغلق حملہ آوروں نے ڈھائی سو سال تک حکومت کی مغلوں کے بعد سکھوں (مہاراجہ رنجیت سنگھ) اور پھر انگریزوں نے کئی سال تک اپنے تخت و تاج کے ساتھ راج کیا بہادر سکھوں کی نشانی مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مقبرہ ہے جو اب تک قائم ہے۔ انگریزوں کی نشانی ملکہ کا بُت تھی جو محمود غزنوی کے اس شہر میں توڑ دیا گیا۔

لاہور شہر جنگِ آزادی کا شہر ہے متحدہ ہندوستان کے زمانے میں انگریز کے خلاف آزادی کی لڑائی میں اس شہر نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

لاہور شہر تحریک پاکستان کا بھی شہر ہے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اس شہر کے منٹو پارک میں پاکستان کے لیے قرارداد پاس ہوئی تھی آج اس مقام پر مینار پاکستان تعمیر ہے اور اس پارک کا نام اقبال پارک رکھا گیا ہے پہلے اس کا نام انگریز حاکم لارڈ منٹو کے نام پر تھا ــــــ افسانہ نگار منٹو کے نام پر نہیں جو سمرالہ (بھارتی پنجاب) میں پیدا ہوا اور پھر امرتسر سے چل کر دہلی اور بمبئی ہوتا ہوا لاہور آ گیا تھا اور میانی صاحب کے قبرستان میں ہزاروں من مٹی کے نیچے سو رہا ہے۔ اسی میانی صاحب میں ان گنت شخصیات محوِ خواب ہیں۔

لاہور باغ و بہار شخصیات کا شہر ہے ــــــ دانشوروں، فنکاروں اور شاعروں کا شہر ہے اکبر کے دور میں عُرفی اور فیضی اسی شہر میں رہے پھر علّامہ اقبال اسی شہر میں آئے مولانا احمد علی لاہوری، مولانا مودودی، مولانا ظفر علی خاں، عبدالرحمٰن چغتائی، شورش کاشمیری، پطرس، صوفی تبسم اور حفیظ ــــــ ایک طویل سلسلہ ہے اقبال لاہور کے رہتے لیکن لاہور کے ہو گئے۔

لاہور متحدہ ہندوستان کا ہالی وُوڈ بھی تھا فلمی دنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر ستارے یہیں چمکے اور بے شمار کامیاب فلمیں بھی یہیں بنیں۔

لاہور شہر تعلیمی اداروں کا شہر ہے پہلے یہاں پنجاب یونیورسٹی تھی اب کئی یونیورسٹیاں موجود ہیں، ان گنت کالج اور کئی ٹیکنیکل تعلیمی اداروں کے علاوہ پاکستان کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن بھی اسی شہر میں واقع ہے

لاہور کے لوگ داتا کی نگری کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں یہاں داتا گنج بخش کا مزار ہے جس سے لاہور والے عقیدت بھی رکھتے ہیں اور پیار بھی کرتے ہیں لاہور ہی میں حضرت میاں میر کا مزار بھی ہے تواسا ست کا درس دیتا ہے حضرت میاں میر وہ صوفی سنت ہوئے ہیں جنھوں نے گولڈن ٹمپل امرتسر کا سنگ بنیاد اپنے ہاتھوں سے رکھا تھا

لاہور ایک زمانے سے طباعت اور صحافت کا بھی مرکز رہا ہے لاہور سے ایک زمانے میں "پیسہ" اخبار جاری ہوا پھر زمیندار کے تیر چلتے رہے۔ انگریزی روزنامہ ٹریبون، ملاپ، پرتاب، نوائے وقت، کوہستان، احسان، مشرق وغیرہ اخبار لاہور کی صحافت میں انقلاب کرکے انگریز کے خلاف آزادی کی لڑائی میں ان میں سے متعدد اخبارات نے بہت اہم رول ادا کیا۔

لاہور کے مندر، مسجد اور گوردواروں نے جہاں دھرم کے عقیدوں کو عقیدت بخشی ہے وہاں شالیمار باغ، شاہی قلعہ، انارکلی، مال روڈ نے اس شہر کو خوبصورتی اور رونق عطا کی ہے۔ پرانے زمانے کی یہ کہاوت عام ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔

لاہور کے چند تاریخی مقامات کی سیر

آج میں لاہور دیکھنے نکل پڑا شہری زندگی کے چار بیٹے ہیں۔ منظر، چندن، عمر اور حسن ثمامنا مشہور غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے اس سے چھوٹے تینوں بیٹے لاہور میں پڑھتے ہیں جو آج لاہور کی سیر کے لیے میرے ساتھ ہو لیے اور ہم نے مینار پاکستان، شاہی قلعہ اور شاہی مسجد دیکھی ان تاریخی عمارتوں اور کھنڈروں میں میری کبھی کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ ایک کہانی جو تاریخ کے اوراق میں درج ہے ان سے مدھم وہیں کھڑی ہے اس کہانی کے نقش دیکھنے سیاح لوگ یہاں آتے ہیں تصویریں کھینچتے ہیں اور کہانی کو بھول جانے کے لیے پھر لوٹ جاتے ہیں جو چند گھنٹے آج میں نے بچوں کے ساتھ گزارے وہ میرے لیے سادہ حسین اور بیش قیمتی لمحے تھے بچوں کی بھولی بھالی باتیں، پیاری شرارتیں اور ان کے سوال جواب میرے دل و دماغ میں رچ بس گئے

جیدن کا اصلی نام تنسیر ہے لیکن نسرین بیتی اُسے جیدن ہی کے نام سے پکارتی ہیں یہ نام تے تی بڑا
پیارا لگا ئیں نے محسوس کیا کہ پروان چڑھ رہی اُس کی عمر اور صحت پر لیے اتابعی رحمٰن صاحب کا زیادہ اثر
ہے اُس سے چھوٹا عمر بھائیوں میں سب سے الگ ہے لیے میں نے پریس کا نام دیا ہے اُس کی عادتیں نائیں اور
تو حیاں شہزادوں جیسی ہیں سب سے چھوٹا حسن ابھی بہت چھوٹا ہے لیکن سبھی بیٹے بے حد ذہین اور بہت پیارے ہیں

میرے ادبی دوست

مجھے یاد آیا کہ جب میں پاکستان کے لیے روانہ ہوا تو کرشن ادیب نے مجھے خاص طور سے کہا تھا کہ لاہور میں
داتا گنج بخش اور حضرت میاں میر کے مزاروں پر میں اُس کی طرف سے حاضری ضرور بھروں یہ فریضہ بھی میں نے
اُسی دن انجام دیا انارکلی کی رونق بھی دیکھی اور شام ڈھلے جب گھر لوٹا تو وہاں مقبول محمد دہلوی میرے منتظر تھے

ذکر مقبول دہلوی کا

میں اپنے آپ کے ساتھ انصاف نہیں کروں گا اگر مقبول دہلوی کا ذکر نہ کروں مقبول کا تعلق دہلی سے ہے
تقسیم وطن کے دوران وہ پاکستان چلا گیا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا پاکستان میں وہ دوسرا شخص ہے جس سے میرے
مراسم بہت پرانے ہیں ایک ڈاکٹر ورزا صاحب سے میرے تعلقات مرحوم دوست راجہ مہدی علی خاں کے توسط سے
پیدا ہوئے تھے جن کی عمر اب اٹھارہ یا بیس برس ہو رہی ہے مقبول سے میرے مراسم کی عمر بھی دس بارہ سال رہی
ہے افسانہ کی دنیا میں اس کا پہلا خط مجھے تب موصول ہوا تھا جب وہ خواتین کے ایک ڈائجسٹ کا مدیر اعلیٰ
تھا اُس کے بعد سے اب تک یہ سلسلہ جاری ہے مقبول ویسے تو پاکستان کے ایک بینک میں آفیسر ہے لیکن ادب
صحافت اور ادیبوں صحافیوں کی قطار میں بھی وہ شریک ہے وہ ہندو پاک کے مشہور ادبی جریدے ماہنامہ بیسویں
صدی، نئی دہلی کے لیے بطور نمائندہ پاکستان میں ایک طویل عرصے سے اعزازی فرض ادا کر رہا ہے پاکستان
کے نمائندہ قلم کاروں کی خوب صورت تخلیقات "بیسویں صدی" اور بعض دیگر ادبی جریدوں کے ذریعہ جو بھارتی
قارئین تک پہنچتی ہیں اس کے پیچھے مقبول کی محنت اور بھاگ دوڑ ہوتی ہے لاکھوں بھارتی قارئین کی ادبی
پیاس بجھانے کے لیے مقبول پاکستانی افسانہ نگاروں اور شاعروں کے پیچھے بھاگتا ہے اُن کے نخرے برداشت
کرتا ہے لیکن نہ نقصان محسوس کرتا ہے اور نہ ہی ناکام ہوتا ہے تجارتی سطح پر بھارت اور پاکستان کے

درمیان کتابوں اور رسالوں کا تبادلہ نہیں ہوتا اس حالت میں دونوں ملکوں کے قارئین کے درمیان مقبول احمد دہلوی ایک ادبی پل کی حیثیت رکھتا ہے وہ روزنامہ "جنگ" کے ثقافتی ایڈیشن سے بھی وابستہ ہے پاکستانی صحافت میں اُس کی اہمیت اور افادیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ہندی زبان بخوبی جانتا ہے۔
ان تمام اوصاف کے علاوہ مقبول میں ایک بہت بڑا وصف اس کی ملنساری، خوش مزاجی اور حلیمی ہے اس شخص کا میں خاص طور سے احسان مند ہوں ـــــ اس لیے کہ میری ذاتی لائبریری میں جو بے شمار پاکستانی ادبی مطبوعات ہیں، ان میں سے بیشتر مقبول احمد دہلوی نے وقتاً فوقتاً مجھے ارسال کی ہیں بغیر کسی فائدے کے دوسروں پر محنتوں اور عنایتوں کا قرض لادنے کا شوق جن چند لوگوں کو ہوتا ہے، مقبول احمد دہلوی ان میں سے ہی ایک ایسا انسان ہے۔

اور اس بھلے انسان سے کھل کر باتیں کرنے کا موقع مجھے آج ملا تھا حالانکہ گذشتہ کئی دنوں میں ہم کئی بار ایک دوسرے سے ملے تھے گھنٹوں ساتھ بھی رہے تھے لیکن یہ ملاقاتیں محفلوں، مذاکروں اور دعوتوں ہی میں ہوئی تھیں آج کی بات اور ساتھ کا سلسلہ رات کے کھانے تک جاری رہا اور پھر آنے والے کل کی صبح کو ملنے کا وعدہ کر کے وہ روانہ ہو گئے۔

ذکر جناب وجے چوہڑہ کا

آج وقت تھا، موقع بھی تھا اور ماحول بھی، کھانے کے بعد دیگر گھریلو کام کاج سے فارغ ہو کر نُستری باتوں کے موڈ میں دکھائی دیں حیدر ور قبل اس گھر میں بطور مہمان میں آیا تھا لیکن اب مہمان ہونے کا احساس نہیں رہا تھا یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں اسی گھر پریوار کا ایک فرد ہوں ـــــ اس گھر کے سبھی باسی میرے اپنے ہیں ـــــ اور اس گھر کی ہر چیز سے میں مانوس ہوں۔ کسی طرح کا کوئی تکلف نہیں تھا، کھلاپن تھا ـــــ جو شلوص کر دل و دماغ میں رچ بس گئی وہ محبت تھی جو ماں جی سے لے کر گھر کے نوکروں تک کی باتوں میں پنہاں تھی۔

نستری جی نے شری وجے کمار (ایڈیٹر روزنامہ "ہند سماچار" جالندھر) کا ذکر چھیڑ دیا جو گذشتہ برس اپنے دورۂ پاکستان کے دوران انھیں ملنے تشریف لائے تھے اتفاق کی بات تھی ڈرائینگ روم میں آمنے سامنے پڑے صوفے پر جس جگہ اس وقت میں بیٹھا تھا نستری نے بتایا کہ وجے بھائی بھی اسی جگہ بیٹھے گھنٹوں ان سے

باتیں کرتے رہے تھے

"شاید حالت اس کے برعکس ہوگی۔" میں نے ٹوک دیا

"یعنی ———؟" بُشریٰ کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

"باتیں وجے بھائی نے نہیں، آپ نے کی ہوں گی!" میری بات سنتے ہی بُشریٰ کھلکھلا کر ہنس پڑیں ——
کہنے لگیں —— "شاید یہی بات ہے ——— وجے صاحب واقعی کم گو ہیں لیکن ہیں بڑے مزے دار
آدمی۔"

مزیدار تو چٹپٹی قسم کی چیزیں ہوتی ہیں لیکن مسٹر وجے تو اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہیں —— بہت سیدھے
سادے آدمی ہیں۔ بہت دھیمے دھیمے بات کرتے ہیں —— دھیمے سے ہنستے ہیں بلکہ صرف مسکراتے ہیں۔"

"کسی کی شخصیت کا یہ دھیما پن بھی تو مزے دار ہوتا ہے —— جس طرح ہر چیز اور ہر بات کا اپنا ایک الگ
مزا ہوتا ہے ——!" اور پھر بُشریٰ نے وجے بھائی کی دھیمی، سنجیدہ، پُرخلوص اور خوب صورت شخصیت کا
مکمل تجزیہ پیش کر دیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بُشریٰ اُن سے کافی متاثر ہیں۔

"وجے بھائی کے بارے میں آپ کے یہ تاثرات اس لیے تو نہیں کہ انھوں نے اپنے اخباروں میں آپ کے ناول شائع
کر کے لاکھوں ہندوستانی قارئین سے آپ کو نہ صرف متعارف کرایا بلکہ وہاں سے بے پناہ شہرت بھی دلائی؟"
میں جانتا تھا کہ یہ سوال بُشریٰ کے مزاج سے میل نہیں کھاتا لیکن جان بوجھ کر انھیں چھیڑنے اور کریدنے کے لیے
میں نے بات کہہ دی۔ قدرتی طور پر بُشریٰ پر شدید اور فوری ردِ عمل ہوا۔

"وجے صاحب کی شخصیت میں بسا ایک بھلا اور اچھا انسان تب مجھے ملا تھا جب میرا ذکر تک بھی
اُن کے اخباروں میں نہیں آتا تھا —— اپنے اخباروں میں مسلسل اشاعت کے لیے انھوں نے میرے ناول
کی فرمائش کی تھی۔ وہ اس کا معاوضہ بھی دینا چاہتے تھے لیکن اپنا ناول لکھ کر میں نے بطور تحفہ انھیں پیش کیا
تھا —— صرف انھیں ہی نہیں بلکہ اپنے ہندوستانی قارئین کے لیے۔ اپنے اخباروں میں انھوں نے ناول
شائع کیا اور لاکھوں پڑھنے والوں نے میری تحریر کو پسند کیا۔ وہاں جو شہرت مجھے ملی، وہ میرے قلم نے مجھے دلائی۔"

اس سوالی آواز میں غرور یا تکبر نہیں تھا بلکہ ایک ایسا وشواس تھا جو فن کار ایمانداری، محنت اور لگن کے
بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ بُشریٰ کے قلم میں واقعی اتنی طاقت اور کشش ہے جس نے ان کے لیے بے پناہ مقبولیت حاصل
کی ہے۔ اس وقت یہی وشواس بُشریٰ کی آواز میں تھا ——!

ایک مکمل خاتون ——— بشریٰ رحمٰن

بات چیت کا سلسلہ چل ہی نکلا تو ہم نے سوچا کیوں نہ اس گفتگو کو باقاعدہ انٹرویو کر لیا جائے اور
——— میں نے بات چیت کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا ——— "آپ کو کیسے اندازہ ہوا
کہ بھارت میں قارئین نے آپکے ناول پسند کیے ہیں ؟"

"میرا ایک ناول "لگن" ہند سماچار (اردو) پنجاب کیسری (ہندی) اور جگ بانی (پنجابی) میں مسلسل
چھپ چکا ہے۔ اور دوسرا ناول "لازوال" تینوں اخبارون میں ان دنوں چھپ رہا ہے میرے پاس روز ہی
ایک بڑی تعداد میں ہندوستانی قارئین کے خط آتے ہیں جو اُردو اور انگریزی کے علاوہ ہندی اور پنجابی
زبانوں میں بھی لکھے ہوتے ہیں۔"

"انگریزی اور اُردو زبانوں میں لکھے خط تو آپ پڑھ لیتی ہیں لیکن ہندی اور پنجابی زبان میں
لکھے خطوط کا آپ کیا کرتی ہیں ؟"

"ایسے بے شمار خط میری فائلوں میں محفوظ پڑے ہیں۔ اب کسی سے پڑھواؤں گی۔"
"مجھے خوشی ہوگی ——— لیکن کیا آپ اپنے قارئین کے خطوط کا جواب دیتی ہیں ؟"
"اس قدر مصروفیت کے باوجود میری یہی کوشش ہوتی ہے۔"
اب بات چیت کا رخ ادب کی طرف مڑ گیا تھا
"آپ کو لکھنے پڑھنے کا شوق کب کیسے اور کہاں ہوا؟" میں نے سوال کیا
"ہمارے گھر کا ماحول مذہبی ہونے کے علاوہ شاعرانہ اور ادبی بھی تھا ہم نو بہن بھائی ہیں۔
مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی تھی تو ابا جی ایک شام ہمارے ساتھ ایک نشست لگاتے تھے ——— انہیں توقع
تھا کہ ان کے بچے علم حاصل کریں، خطیب بنیں، ادیب شاعر بنیں اور دنیا میں نام پیدا کریں ——— میری
بہن رفعت شاعرہ ہیں اُن سے باقاعدہ ترنم سے شعر سنتے اور اچھے شعر پر انعام بھی دیتے میری امی بھی شاعرہ
تھیں۔ ماں سے ان کا کلام سنتے سالانہ مشاعروں کا اہتمام کرتے اُن کا ایک کتب خانہ بھی تھا جس میں دنیا بھر
کی کتابیں بھری ہوئی تھیں وہیں سے بہت چھوٹی عمر میں مجھے پڑھنے کی لت لگ گئی تھی اور ابا جی میری اس
عادت کو بے حد پسند کرتے تھے وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھا کرو۔ بڑے لوگوں سے

راہ و رسم رکھا کرو۔ مشہور لوگوں کو قریب سے دیکھو اور عظیم انسانوں سے خط و کتابت کیا کرو۔ اس طرح تم بہت کچھ سیکھو گے۔ ابا جی علم اور تجربے کا سمندر رکھتے مگر افسوس جب پیاس بجھانے کا وقت آیا تو وہ چشمہ ہی سوکھ گیا اور پھر امی جان تو واقعی اللہ کے نور کا ٹکڑا تھیں ایثار و محبت میں گندھی ہوئی اگر کبھی میں ان کے بارے میں لکھتا ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی رگوں کا خون نچوڑ کر اس کی سیاہی بنالوں اور دونوں آنکھوں کو قلم کی نوک پر رکھ دوں، تب بھی میں ان کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ آج میں جو کچھ ہوں انہی کی وجہ سے ہوں میرا اپنا تو کچھ بھی نہیں دماغ میں نے ابے بابا سے لیا اور سوز و گداز کا خزانہ میری ماں نے دیا ہے ——— بھلا صرف قلم چلانے سے کوئی ادیب بن سکتا ہے؟"

ماضی میں کھوئی نسترین کی نم آلود آنکھوں میں عقیدت اور محبت تھی میں نے بات کا رُخ موڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ——— "آپ کے افسانوں اور ناولوں میں محنت کرنے والے ظلم کرنے والے اور ظلم سہنے والے کردار ہوتے ہیں مرد ظالم اور عورت مظلوم نظر آتی ہے ——— ایسا کیوں ہے؟"

"ظالم اور مظلوم کے علاوہ بھی تو بہت کچھ میرے کرداروں میں ہوتا ہے لیکن جہاں تک عورت کی بات ہے، اُسے مقابلہ کرنے کی تربیت ہونی چاہیے ——— مگر حالات کا مقابلہ کرنے کی تربیت ہونی چاہیے، شوہر کا نہیں۔"

"کیا شوہر مرد نہیں ہوتا؟"

"یقیناً ہوتا ہے، لیکن پہلے وہ شوہر ہوتا ہے ——— عورت کو ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے مگر شوہر کی برابری نہیں کرنی چاہیے جہاں تک عورت کے برداشت کرنے کی بات ہے، یہ تو میں عبادت ہے دُنیا میں سب سے بڑا کرب تخلیق کا کرب ہے، اور وہ بھی تو عورت ہی سہتی ہے ——— یہاں پر سہنے یا برداشت کرنے کا مطلب تحمل، بردباری اور فراست ہے انکساری اور حلم تو عورت کی بنیادی خصوصیات ہیں اور وہ اپنی انہیں خوبیوں کی وجہ سے ظالم مرد کو بھی جیت لیتی ہے۔"

جب ہم محنت کرنے والے کرداروں کی بات کرتے ہیں تو ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت ہوتی ہے ——— اس کے روپ مختلف ضرور ہو سکتے ہیں مرد اور عورت کے تعلقات کے موضوع پر بات چل نکلی تو نسترین کے قلم کار ذہن کی عورت کو اُکسانے کے لیے میں نے اسی موضوع پر بات جیت جاری رکھی ——— "عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب مرد محبت کرتا ہے تو یہ اس کی زندگی کا محض ایک واقعہ ہوتا ہے،

لیکن عورت کی بات اس کے برعکس ہوتی ہے یعنی عورت کی محبت اس کی زندگی کی ایک داستان بن جاتی ہے ——— بشریٰ! آپ کیا کہتی ہیں؟"

"کیوں بھائی، آپ بھی کہانیاں لکھتے ہیں اور مرد بھی ہیں آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟" بشریٰ کے الفاظ میں شوخی اور شرارت تھی۔

"سوال پہلے میں نے کیا ہے ——— جواب پہلے آپ کو دینا ہے"

"سچ بات کہوں ——— مردوں کے بارے میں لکھتے وقت کسی بھی خاتون ادیبہ کو متعصب نہیں ہونا چاہیے مرد عورتوں کی طرح کے انسان ہوتے ہیں ان کا دل بھی ہے اور دلی جذبات بھی ——— صرف یہ ہے کہ مرد نے اپنے اوپر بہادری کا خول چڑھا رکھا ہے محبت دونوں پر ایک جیسا اثر کرتی ہے جس طرح عورت اپنی زندگی کے پہلے مرد کو نہیں بھول سکتی اسی طرح مرد اپنی زندگی کی آخری عورت کو نہیں بھول سکتا یعنی آخری عورت ہی ہوتی ہے جس سے اسے سچی محبت ہوتی ہے۔ محبت شادی سے پہلے ہو یا شادی کے بعد سچ سچ کی محبت سے پہلے وہ جتنے کھیل کھیلتا ہے وہ اس کو مرد بننے میں مدد دیتے ہیں اور وہ مرد کے لیے مزدوری بھی ہوتے ہیں اس کی راہ گذر تجربوں سے اٹی پڑی ہے جب تک وہ خود اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہو جاتا، تجربہ گاہ سے گذرتا رہتا ہے یہیں کہیں اسے وہ اصل عورت نظر آ جاتی ہے جو اس کے دل میں گھر کر لیتی ہے خواہ وہ اسے بیوی بنا کر گھر میں ڈال لے یا دلہن بنا کر خیالوں میں سجا لے اگر عورت کی طرح مرد اپنے زخموں کو ہرا رکھے تو وہ دنیا کے لیے ناکارہ ہو جاتا ہے اس لیے وہ بظاہر آزاد و آوارہ اور بے رحم جو نظر نہیں آتا، مگر حقیقت میں جو مرد محبت کی اصلیت کو جان جاتا ہے وہ محبت پر اپنی جان دے دیتا ہے۔"

مرد اور عورت کے جذباتی تعلقات اور محبت کی سماجی حقیقت پر بشریٰ کی صاف گوئی اس کے کرداروں میں جھلکتی ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے شاید کوئی مرد اسے یوں تسلیم کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوگا جیسا کہ بشریٰ نے بلا جھجک اور بہت صاف گوئی سے بیان کر دیا۔ بشریٰ کی شخصیت واقعی ایک کھلی کتاب ہے

میں نے بشریٰ رحمن سے ایک ذاتی سوال کر دیا ——— "اپنے افسانوں اور ناولوں میں آپ مردوں سے کوئی رعایت نہیں کرتیں یعنی ان کی خوب دھجیاں اڑاتی ہیں۔ آپ کے شوہر میاں رحمن صاحب کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے؟"

"رحمن تو میری سب سے بڑی خوش قسمتی ہیں۔ اُن کے آسرے پر تو میں بے دھڑک لکھتی چلی جاتی ہوں۔

اگر وہ تنگ نظر اور کوتاہ ظرف ہوتے تو کیا میں یوں بے باکی سے لکھ سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔ کیں لیے تو بہکے حدمات اور حالات کا احترام کرتی ہوں میرے قلم کے بھی کچھ تقاضے ہیں جس کا وہ احترام کرتے ہیں اور بعض اوقات اچھے مشوروں سے بھی نوازتے ہیں دو بالغ انسانوں کی طرح ہم ایک دوسرے کو لیے اپنے راستے پر جانے دیتے ہیں۔ نظریاتی اختلاف رسدگی اور حرارت کی دلیل ہے مگر ہم ایک دوسرے کو غائر کرنے کے قائل نہیں کرنے ملکہ جب کسی کہانی میں میں مرد کی فطرت کو بے نقاب کرتی ہوں تو وہ حیران ہو جاتے ہیں، مگر ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ دہیں بیوی بہت خطرناک ہوتی ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سب کچھ لکھنے سے پہلے میں نے اُس مرد کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جو دن رات میرے ساتھ رہتا ہے اور دنیا میں ہر قسم کے مرد ہیں اور ہر قسم کے مرد پر لکھا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں اور نہ ہی میرے شوہر کسی احساسِ کمتری کا شکار ہیں کہ خواہ مخواہ اُلجھتے رہیں کبھی کوئی افسانہ پسند نہ آئے تو صاف کہہ دیتے ہیں مگر خدا کا شکر کہ ایسی باتیں جھگڑے کا باعث نہیں بنتیں ۔۔۔۔۔ مگر کسی شاعر نے کہا ہے نا ؎

مزاج ایک، نظر ایک، دل بھی ایک سہی   کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں!

نسترن رحمٰن جہاں برِّصغیر ہند کی مقبول ترین اُردو ادیبہ ہیں وہاں میاں رحمٰن صاحب ایک مصروف ترین اور بہت بڑے کاروباری انسان ہیں ۔۔۔۔۔ یعنی میاں بیوی دونوں ہی اپنی الگ پہچان اور الگ مقام کے مالک ہیں زیادہ شہرت نسرین کے حصے میں آئی ہے۔ میں نے ایک سوال کیا ۔۔۔۔ "عام طور پر مرد یہ نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی کی اپنی الگ شخصیت ہو وہ جہاں اور جب بھی پہچانی جائے اسی کے حوالے سے پہچانی جائے اور جہاں کہیں اس کے برعکس صورتِ حال ہو تو گھر اکھاڑہ بن جاتے ہیں آپ اسے تعلق سے اس بارے میں کیا کہتی ہیں؟"

"ہاں ۔۔۔۔۔ گھر اکھاڑہ بن سکتا تھا اگر میں چند باتوں کا دھیان نہ رکھتی تو میرے خیال میں ان باتوں کا دھیان ہر اس عورت کو رکھنا پڑتا ہے جو گھر میں مرد کی برتری کو تسلیم کرتی ہے اس لیے میں گھر میں نسترن رحمٰن نہیں ہوتی صرف ایک بیوی اور ایک ماں ہوتی ہوں اور گھر کے معمولات پر صرف میرے بچوں اور میرے شوہر کا استحقاق ہوتا ہے اگر بیوی گھر کے تمام فرائض باقاعدگی سے ادا کرتی رہے، بچوں کو وقت دے، شوہر اور بچوں کا کام اپنے ہاتھ سے کرے تو شکوے کی گنجائش نہیں رہتی ۔۔۔۔۔ بس اسی لیے سکون سے گذر رہی ہے۔" نسترن نے مہابت اطمینان سے کہا۔

"میاں رحمٰن صاحب اکثر گھر سے باہر رہتے ہیں ـــــ ایسے میں سارے گھر کی ڈھیر ساری ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ بچے بھی چھوٹے ہیں اس پر آپ برابر لکھ رہی ہیں۔ بیجاپور اسمبلی کی رکن کی حیثیت سے سیاسی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ وطن دوست لمیٹڈ کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی چلا رہی ہیں۔ ایک ماہنامہ کی اشاعت کی تحریر بھی ہے ـــــ یہ تمام کام نہ صرف توجہ بلکہ سخت محنت طلب ہیں ـــــ ان تمام جھمیلوں سے آپ کبھی اوب تو نہیں جاتیں؟" بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔

"کبھی کبھی تنگ آجاتی ہوں۔ جی چاہتا ہے، عام عورتوں کی طرح بس بنے سنورے کپڑے پہن کر بازاروں میں شاپنگ کیا کروں بیگمات کی طرح فضول گپّوں میں وقت ضائع کرتی رہوں ـــــ مگر نہیں، میں تو مشکل راستوں کی مسافر ہوں۔ اسی لیے خیال آتا ہے کہ بے مقصد زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ لاکھوں عورتیں بے مقصد زندگی گزارتی ہیں۔ دنیا میں کچھ نہ کچھ کر کے جانا چاہیے۔ بس یہی سوچ کر پھر اُسی رفتار سے کام میں جٹ جاتی ہوں ـــــ میری ماں جی عظیم ہندوستانی خاتون سروجنی نائیڈو کا ذکر کیا کرتی تھیں اُن کے بارے میں میں بہت کچھ جاننا اور پڑھنا چاہتی ہوں جب آپ بھارت واپس جائیں تو مجھے اُن کی سوانح حیات ضرور بھجوائیں"

میں نے وعدہ کیا تھوڑی دیر کے لیے بات چیت کا رخ بھی بدلا لیکن میں نے اپنے موضوع کو پھر آگے بڑھایا ـــــ "آپ نے سیاست میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیوں کیا اور کیا رحمٰن صاحب کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوا؟"

"رحمٰن صاحب کی رضامندی کے بغیر میں کوئی کام نہیں کرتی جہاں تک سیاست میں حصّہ لینے کا سوال ہے۔ بیجاپور اسمبلی میں میں خواتین کی نمائندگی کرتی ہوں یہ بھی تو زندگی کا ایک اہم اور بامقصد حصّہ ہے" سیاست پر میں نے زیادہ بات نہیں کی میری دلچسپی تو نسترن کی شخصیت کو زیادہ سے زیادہ جاننے پہچاننے میں تھی ـــــ "آپ کی تخلیقات، تجربات اور مشاہدات گواہ ہیں کہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ کام آپ نے کیا ہے۔ اس کا کیا راز ہے؟"

"میں کبھی خالی نہیں بیٹھ سکتی اور پھر جوں جوں وقت گزر رہا ہے ایک ایک پل قیمتی لگ رہا ہے۔ شادی سے پہلے کا وقت تو تعلیم حاصل کرتے گزرا شادی کے فوراً بعد ایک خوشگوار زمانہ آیا تھا میرے شوہر صبح دفتر چلے جاتے میرا چھوٹا سا گھر تھا۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب لڑکی حقائق کی دنیا میں قدم رکھتی ہے خواب

ٹوٹتے پھوٹتے ہیں۔ تمنائیں جو نئے بدل بدل کر سامنے آتی ہیں ہم کچھ اور سوچتے بیٹھے ہوتے ہیں اور حالات کچھ اور رستیں آجاتے ہیں شادی سے پہلے کسی بھی لڑکی کو مرد کی فطرت کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا وہ لوکھلا جاتی ہے۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ نے خوب صورت مدوسب رکھ چھوڑا ہے کہ بچہ ہو جاتا ہے توڑ پھوڑ کے ساتھ تخلیق کا عمل شروع ہو جاتا ہے یوں عورت کو سمتوں کے ساتھ جینے کا حوار مل جاتا ہے پہلا بچہ یا لتا مشکل بھی ہے اور روح پرور بھی۔ ابھی دلوں مجھ پر کھلا کہ عورت کا بنیادی کام بچے پیدا کرنا اور انھیں پالنا ہے میں نے اپنے بچوں کی پرورش خود اپنے ہاتھوں سے کی ہے میں نے کبھی آیا نہیں رکھی کیوں کہ میرا خیال ہے کہ ماں کے ہاتھوں کا لمس بچوں کی موبیں بڑا کام کرتا ہے اور پھر گھر کا کام کرنے سے زندگی کے تجربات میں عجیب و غریب قسم کا اضافہ ہوتا ہے " نسترین زندگی کے فلسفے پر بڑی بات کہے جا رہی تھیں ـــــ " شادی کے پہلے دس سالوں میں مرے چار بچے پیدا ہوئے اور میں ان میں کھو گئی مگر شعر و شاعری بھی تو ہے کہ حساس لوگوں کی زندگی میں اد ولہریں متواتر چلتی رہتی ہیں اندر کا عمل جاری رہتا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ کسی صورت باہر آتی رہتی ہے اس لیے سوچنے اور لکھنے کا عمل جاری رہا۔ حالاں کہ اس کر بناک کیفیت کو ختم کرنے کے میں نے لاکھ جتن کیے مگر دل میں جلنے والا دیا کبھی نہ بجھا اور پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ حساس لوگوں کی زندگیوں میں بڑے کڑے موڑ آتے ہیں اور یوں لگتا ہے قدرت ہمارے ساتھ بڑا ظلم کر رہی ہے مگر جب ان کڑے اور کٹھن راستوں سے گزرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ قدرت کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہے کیوں کہ کٹھن مرحلوں سے گزرے بغیر سوچ میں پختگی آتی ہے نہ قلم میں روانی پیدا ہوتی ہے اور تجربے کی بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد ہی عرفان و آگہی حاصل ہوتے ہیں "

" اچھا نسترین! آپ یہ بتائیں کہ آپ کو اتنی شہرت ملی آپ کیا محسوس کرتی ہیں؟ " میں نے سوال کیا جواب میں نسترین نے ساختہ یہ شعر پڑھ دیا

" جو اہلِ دل ہیں بڑھاتی ہے آبرو اُن کی — جو بے شعور ہیں ان کو خراب کرتی ہے

مجھے شہرت سے ایک ہی تجربہ ہوا ہے کہ کم ظرف دوست دشمن ہو جاتے ہیں اور عالی ظرف دشمن دوست بن جاتے ہیں "

" بہت خوب "، میں نے ادب کے حوالے سے چند باتیں کرنے کی خواہش محسوس کی اور پوچھ لیا ـــــ

" آپ نے پہلا افسانہ کب لکھا؟ "

"شاید ۱۹۵۵ء میں ___ عنوان تھا ___ "پھر یادوں کے دیپ جلے"

"اب تک آپ کتنا کچھ لکھ چکی ہیں ؟"

"اڑھائی تین سو افسانے ___ چند ناولٹ ___ ایک سفرنامہ ___ اور پانچ ناول"

"کچھ ماضی اور حال کے بارے میں ۔"

"۱۹۶۳ء میں جرنلزم میں ایم اے کیا ___ صوبائی اسمبلی پنجاب، پنجاب یونیورسٹی سینٹ، پنجاب کونسل آف آرٹس اور ڈویژنل کونسل بہاولپور کی ممبر رہی ہوں سعودی عرب، امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، ہالینڈ، جرمنی، جاپان، فرانس، ملیشیا، انڈونیشیا اور بھارت وغیرہ بہت سے ملکوں کا سفر کیا ___ میرا خیال ہے کہ اتنا ہی کافی ہے ۔"

میں ہنس پڑا اور میرے ساتھ نسرین بھی ہنس دیں

"نسرین جیسا کہ آپ نے پہلے بتایا کہ وطن دوست لمیٹڈ کے نام سے آپ ایک اشاعتی ادارہ بھی چلا رہی ہیں لیکن اس سلسلے میں دو باتیں میں نے خاص طور سے نوٹ کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس ادارے سے صرف آپ کی اپنی ہی کتابیں شائع ہوئی ہیں دوسری بات یہ کہ ان کتابوں کی قیمت بہت زیادہ ہے اس بارے میں آپ کیا کہیں گی ؟"

"یہ صحیح ہے کہ اس ادارے سے ابھی تک میری اپنی کتابیں ہی شائع ہوئی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی تو یہ ادارہ دوسروں کی کتابیں بھی شائع کرے گا ___ لیکن آپ کا اشارہ شاید اس طرف ہے کہ میری کتابیں دوسرے اشاعتی اداروں سے شائع کیوں نہیں ہوئیں ؟ وجہ صرف اتنی سی ہے کہ میں اشاعت کے معیار، سلیقے اور خوب صورتی سے سمجھوتہ نہیں کر سکتی میں بہت حساس ہوں اور میری اپنی ایک خاص پسند ہے ورنہ ایسے ملنسر کی کمی نہیں تو میرے ناول شائع کرکے فخر محسوس کرتے ___ دوسری بات آپ نے کتابوں کی قیمت کے بارے میں کہی ہے کتابوں کی اشاعت میرے لیے کوئی کاروبار نہیں لیکن معیاری پیپر کاری کے لیے خرچ بھی تو آتا ہی ہوتا ہے ۔" نسرین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ___ "ہم لوگ شادی بیاہ اور دیگر ایسے مواقع پر ہزاروں، لاکھوں روپے کے تحفے دینے کی عیاشی تو کر سکتے ہیں، لیکن کتابیں جو علم کا خزانہ ہوتی ہیں، اگر ذرا سی مہنگی ہیں تو ہم شور مچاتے ہیں ___ وغیرہ وغیرہ ___ ۔"

نسرین جذباتی ہو گئی تھیں اُن کے جذبات کی شدت میں حقیقت کی تلخی تھی۔

" ادب کے بارے میں ایک سوال اور ـــــــ ! پاکستان میں بے شمار ڈائجسٹ شائع ہوتے ہیں اور ان میں خواتین کے لیے ڈائجسٹ جو ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ خالص ادبی پرچے بھی شائع ہوتے ہیں۔ ادب کے حوالے سے نقاد حضرات ڈائجسٹ قسم کے پرچوں کو اہمیت نہیں دیتے یا یوں کہہ لیں کہ انھیں وہ دوسرے درجے کے پرچے تسلیم کرتے ہیں۔ نقاد لوگوں کے نقطۂ نظر سے ایسے پرچوں میں چھپنا کیا آپ کی ادبی حیثیت اور مقام کو کم نہیں کرتا؟ "

نسترن لمحہ بھر کے لیے خاموش اور سنجیدہ ہو گئیں اور پھر کہنے لگیں ـــــــ " اگر میں یہاں کے نقاد حضرات، ایوانِ ادب کے چند بڑے بڑے ناموں یا دوسرے ایسے لوگوں کے بارے میں کچھ کہہ دوں تو مجھے ادبی گروہ بندی میں گھسیٹ لیا جائے گا، جس سے میں ہمیشہ ایا دامن بچاتی آئی ہوں۔ یہ بزرگ لوگ ہیں میں اُن کا احترام کرتی ہیں ـــــــ لیکن میں یہ تسلیم نہیں کرتی کہ ڈائجسٹ دوسرے درجے کے پرچے ہوتے ہیں ـــــــ خاص طور سے وہ جس میں میں چھپتی ہوں۔ ان پرچوں کی فائلیں دیکھیں تو حقیقت سامنے آجائے گی کہ بہت بڑے ادبی نام بھی ان میں چھپے مل جائیں گے۔ کیا وہ بھی دوسرے درجے کے ادیب ہو گئے ـــــــ میری ادبی حیثیت اور مقام کیا ہے ـــــــ اس سوال کا جواب میرے لاکھوں قارئین کے پاس ہے جن کے لیے میں لکھتی ہوں اور جو مجھے احترام اور محبت سے نوازتے ہیں "

میں اور نسترن رحمٰن باتیں کر رہے تھے تو تھوڑی دیر کے لیے میاں رحمٰن صاحب بھی تشریف لے آئے۔ ان کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جان بوجھ کر نسترن سے میں نے پوچھ لیا ـــــــ " رحمٰن صاحب سے آپ کی شادی مرضی سے ہوئی یا والدین کی طرف سے طے کی گئی تھی؟ "

نسترن نے رحمٰن صاحب کی طرف دیکھا اور رحمٰن صاحب کی نگاہیں نسترن کی جانب اُٹھ گئیں اور پھر دونوں ساتھ ساتھ مسکرا دیے۔

" یہ سوال رحمٰن صاحب ہی سے پوچھیے " نسترن نے کہا اور میری نگاہیں رحمٰن صاحب کی طرف مڑ گئیں۔

" ایک طویل داستان ہے جناب " کہتے ہوئے رحمٰن صاحب نے ایک طرح محبت کی ساری کہانی سنا دی۔ اس کہانی کی مکمل تفصیلات کا اندازہ نسترن کے ان چند الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے وہ کہہ رہی تھیں ـــــــ ۔۔۔۔ رحمٰن صاحب نے دھمکی دی تھی کہ اگر ان کی شادی مجھ سے نہیں کی گئی تو وہ مجھے (نسترن رحمٰن کو) زبردستی اٹھا کر لے جائیں گے "

"یعنی آپ نے رئیس صاحب کی دھمکی سے ڈر کر ان سے شادی کی ہامی بھر لی" میں نے پوچھا۔

"نہیں صاحب، ایسا قطعی نہیں ہے ہمیں تو ان کا یہ انداز بڑا پیارا لگا اس دھمکی میں پیار کی شدت بھی تھی مرد کی مکمل مردانگی کا اظہار تھا ـــــ اور ہمیں خوشی ہوئی" نسترن بہت مزے لے کر کہہ رہی تھیں ساتھ ہی انھوں نے ایک دلچسپ واقعہ بھی سنا ڈالا ـــــ "ہمارے لیے بہت جگہوں سے رشتے آرہے تھے ایک صاحب جو بہت تعلیم یافتہ اور مالدار تھے اور کسی غیر ملک میں سکونت پذیر تھے، ہم سے شادی کرنے کے خواہاں ہوئے بات چیت چلی تو امی جی سے کہنے لگے کہ وہ اُن کی لاڈلی بیٹی کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہونے دیں گے، اُس کی ہر خواہش کو پورا کریں گے ـــــ وغیرہ وغیرہ ـــــ اور اگر وہ چاہیں تو ہم کھانا تک ان کے لیے تیار کریں گے ہمیں تمام سالن، سبزیاں، ترکاریاں سامنا آتی ہیں ـــــ صرف ایک کھڑی مسالا نہیں آتی لیکن وہ بھی ہم سیکھ لیں گے ـــــ ان کی عاجزانہ حالت پر ہمیں بہت ترس آیا لیکن حیرانی ہوئی کہ دنیا میں ایسے بھی مرد ہوتے ہیں۔ ہم نے کہہ دیا کہ کسی مرد سے شادی کریں گے ـــــ کسی ایسے زنانہ قسم کے آدمی سے نہیں ـــــ ۔"

اور نسترن جب رئیس صاحب کی تعریف کرنے لگیں تو وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے لیکن نسترن کہتی گئیں ـــــ "عشق کرنا ہماری کمزوری ہے ـــــ بلکہ عشق ہماری روح ہے پہلا عشق میں نے اپنی ماں سے کیا، پھر حسن سے کیا، نیکی سے کیا، سچائی سے کیا اور پھر رئیس سے کیا رئیس پرائس جہاں مرد ہے مجھے اس کے اکھڑپن سے پیار ہے۔ وہ بڑا ضدی ہے۔ اس کی ضدیں مجھے پیاری ہیں وہ جتنا جتنا ہے اتنا جاتا ہے میں اس کے آگے ٹوٹ گئی ہوں، مٹ گئی ہوں، لیکن اس مٹنے میں مجھے بہت کچھ حاصل ہوا ہے ـــــ وہ انتظار دیتا ہے تو میں اس انتظار سے اپنا بنا لیتی ہوں وہ جدا ہوتا ہے تو میں جدائی کے لمحوں کو گھڑیوں کے قلم سے چُن چُن کر کاغذ پر سجاتی چلی جاتی ہوں اور اس کا وصل میرے لیے بہاروں کے وصل سے کم نہیں ہوتا اور میرا قلم پھول اُگلنے لگتا ہے اور ابھی دامن پھولوں سے بھرا بھی نہیں کہ وہ چلا جاتا ہے اور پھر انتظار کی رُت آجاتی ہے جدائی کے موسم جوان ہو جاتے ہیں اور میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ جدائی نہ ہو تو ملن کے مزے نہیں آتے۔"

رات کے بارہ بج رہے تھے اور ماحول پر نسترن کی شخصیت کی خوشبودار باتوں کا سحر اپنا بھرپور تسلط قائم کر چکا تھا ـــــ لیکن سب کو سو کر صبح جلدی اُٹھنے کی مجبوری درمیان میں آکھڑی ہوئی اور سب خیر کہتے ہوئے ہم اپنے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

پاکستان میں مہابھارت

۲ جنوری کا آغاز ٹھیک اسی طرح ہوا جیسے کسی بھی مذہبی عقیدے کو ماننے والا انسان لیے رب خدا، بھگوان یا واہگورو کا نام لے کر دن کا آغاز کرتا ہے۔ بھگوان یا خدا میں میرا یقین ہے یا نہیں۔ اگرچہ تو کس روپ میں یاد کرتا ہے اس کا ایک دھیما سا احساس من کے کسی کونے میں کہیں بسا ہو سکتا ہے لیکن اس احساس نے ایسی شدت کبھی اختیار نہیں کی جو مجھے کسی مندر، مسجد یا گوردوارے میں سجدے کے لیے جانے کی تحریک عطا کرے لیکن یہاں ایسے کسی عقیدے کی بات نہیں کر رہا بلکہ اس انسان کی بات کر رہا ہوں جو مذہب کے عقیدے سے مسلمان ہے لیکن دیگر مذہبوں اور عقیدوں کے بارے میں نہ صرف اس کی گہری دلچسپی ہے بلکہ اس موضوع پر بہت کام کیا ہے میری مراد جناب عبدالعزیز خالد سے ہے۔

مستقل مزاج مصنف عبدالعزیز خالد

جناب عبدالعزیز خالد لاہور میں انکم ٹیکس کمشنر کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں معمول دہلوی نے بغیر اطلاع کے مجھے اُن سے ملانے صبح ہی ان کے دفتر لے گئے خالد صاحب میرے نام سے واقف تھے میری لاہور آمد کی اطلاع بھی شاید انھیں اخبارات سے مل چکی تھی اپنی تمام تر مصروفیات کو وقتی طور پر منسوخ کر کے وہ بڑے تپاک سے مجھے ملے اور باتوں میں کھو گئے ______ اور باتوں ہی باتوں میں پہلی بار مجھ پر یہ راز افشا ہوا کہ خالد صاحب نہ صرف اُردو کے قادر الکلام شاعر ہیں بلکہ دنیا کی مختلف سات یا آٹھ زبانوں پر انھیں عبور حاصل ہے ان کی شعری تخلیقات دکتابی شکل میں جن کی تعداد کم و بیش چالیس ہے وہ ایک مستقل مزاج مصنف ہیں انھوں نے دنیا کی کئی زبانوں سے عربی، فارسی یا انگریزی کے توسط سے کئی اہم کتابوں کے ترجمے کیے ہیں اس سلسلے میں اُن کا ایک بڑا کارنامہ اقبال و عطیہ ہے یہ کتاب ان مکتوبات کا مجموعہ ہے جس ۔ ۔ ملہ علامہ اقبال اور اپنے دور کی انتہائی ذہین خاتون عطیہ فیضی کے درمیان جاری رہا تھا

مہابھارت کتھا مالا" کے عنوان سے زبان اُردو پاکستان میں اُن کی نئی تصنیف شائع ہوئی ہے بلاشبہ یہ ایک میں مہاتحفہ ہے جو خالد صاحب کے قلم نے اُردو ادب کو دیا ہے مہابھارت ہندوؤں کا ایک مقدس اور تاریخی گرنتھ ہی نہیں بلکہ مسرن کا وہ" ایپک" ہے جس کا ترجمہ دنیا کی بالو-

میں ہو چکا ہے جناب حالد الطاف اُردو زبان میں شاید پہلی بار اس عظیم کتاب کو منتقل کیا ہے
حالد صاحب نے بڑی محنت اور احترام کے ساتھ اس کتاب کی جلد چھٹے یتیں کی تومری خرابی
کی اظہار رہی انھوں نے اپنی بات جب میں جب گیتا، چاروں وید اپنشد، یج منترو غیرہ مہان گرنتھوں
اوران کے فلسفے کا ذکر کیا تو میرا جی چاہا کہ اُن ہاتھوں کو چوم لوں جنھوں نے مہابھارت کتھی مالا لکھی
مہابھارت ایک ضخیم تصنیف ہے لیکن حالد صاحب نے اس کی تلخیص کی ہے۔ یہ کتاب تین حصوں میں تقسیم
کی گئی ہے پہلے حصے میں حکمت کی باتیں درج ہیں، دوسرے حصے میں کتھائیں یعنی کہانیاں ہیں اور ان دونوں
حصوں کے درمیان حرف کی فصل ہے جس میں حسن اسلوب بیان کے نمونے ہیں مہابھارت سے تعلق رکھنے
والی مختلف کتھاؤں یعنی سمندر منتھن کی کہانی، راجہ پانڈو کی کہانی، ارجن اور اوروتی کی کتھا، راجہ پریکشت
کی کتھا، راجہ دشینت اور شکنتلا کی کہانی، ساوتری کی کتھا کوشک براہمن کی کتھا، راجہ نل کی کہانی ــــ
وغیرہ کا بہت ہی خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے یہ وہ دلچسپ کتھائیں ہیں جنھیں صدیوں سے لوگوں نے
نہایت ذوق وشوق سے پڑھا ہے اور آج بھی مسلسل پڑھا جا رہا ہے پاکستان جیسے اسلامی دیش میں
اُردو زبان میں اس کتاب کی اشاعت ایک بہت بڑا کارنامہ ہے ــــ خصوصاً اس لحاظ سے کہ مقصد
بھارت کے عظیم فلسفے، تہذیب اور تمدن سے نئی نسل کو روشناس کرانا۔
مہابھارت جیسی عظیم کتاب کو اُردو میں منتقل کرنا آسان کام نہیں ہے اس کی زبان کافی مشکل ہے
پہلے تو اس زبان پر مہارت حاصل ہونی چاہیے دوسری بہت بڑی بات خود کو اس فضا سے ہم آہنگ
کرنا ہے جو اس گرنتھ پر شروع سے آخر تک چھائی ہوئی ہے حالد صاحب نے اس فضا کو اپنے اندر جذب
کر کے اپنی زبان میں حسن خوش اسلوبی، مہارت اور خوب صورتی سے اظہار کیا ہے۔ اُن کی قلبی وسعت
اور عظمت ہے

مہابھارت کی تلخیص

"مہابھارت کتھی مالا" کتاب کے دوسرے باب کی چند سطریں بطور نمونہ یہاں پیش ہیں
ماتا، پیتا اور گورو تینوں ترلوک سروپ ہیں ــــ گورو تین قسم کے ہیں ــــ
ایک وِدیا پڑھانے والا، دوسرا پِتا، تیسرا ماتا ماتا کی پوجا سے یہ لوک پِتا کی پوجا سے

یہ لوک گوروکی پوجا سے پرم لوک ملتا ہے
ماتا کا گورو (ماں، بڑائی، مرتبہ) ربیں سے بڑھ کر ہے پتا کا آکاش سے بھی افضل
ہے۔ گورو تم (اندھیرے) کی منزل سے پرکاش (روشنی) کی منزل میں لے جاتا ہے۔ آچاریہ
(اُستاد) کے اُپدیش سے جو جسم ہوتا ہے وہ اَمر (سدا جواں عرفانی) اور امر (جاودانی)
ہے ــــ جو ماتا، پتا اور گورو ان تینوں کا اپمان، اُن کے وچن کا الّنگھن (حکم عدولی)
کرتا ہے، اس کا کبھی اس لوک اور پرلوک میں پیش نہیں پھیلتا اور پرلوک میں بھی کبھی
اس کا کلیان نہیں ہوتا ــــ۱"

جناب عبدالعزیز خالد نے نہ صرف اسلوب کی طرف پوری توجہ دی ہے بلکہ سنسکرت کے مشکل الفاظ
کا سرکٹ میں اُردو ترجمہ بھی کیا ہے ضخیم مہابھارت کو تنگ کھنگ ہوئے چار سو صفحات میں اس انداز میں
منتقل کیا ہے کہ ہر اُردو داں آسانی اور دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ کر سکے
خالد صاحب کے حاشئے کی بھی داد دینی ہوگی جب انھوں نے کافی عرصے قبل پڑھی میری کہانیوں کے
پلاٹ، کردار، اُسلوب اور طرز بیاں پر اپنی رائے کا اظہار کیا تو مجھے واقعی حیرت ہوئی ایسے مخلص اور شاندار
انسان سے مل کر کس کو خوشی نہ ہوگی

نیشنل کونسل آف پاکستان میں

خالد صاحب سے تفصیلی گفتگو کے بعد ہم لوگ نیشنل بک کونسل آف پاکستان کے دفتر روانہ ہوگئے۔
کونسل کے ڈپٹی ڈائریکٹر اور اُردو کے مشہور قلم کار جناب ذوالفقار احمد تابش صاحب سے ملاقات کا
وقت طے ہوا تھا تابش صاحب ہمارے منتظر تھے وہ بہت گرم جوشی اور محبت سے ملے بھارت میں اُردو
زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر بہت تفصیل سے باتیں ہوئیں۔ اسی موضوع پر پاکستان کے حوالے
سے بھی بات چیت ہوئی۔ انھوں نے نیشنل بک کونسل آف پاکستان کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی جانکاری
دی یہ کونسل قومی سطح کا ایک سرکاری ادارہ ہے تابش صاحب نے بتایا کہ کسی بھی ملک کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی
کا دار و مدار براہِ راست تمام سطح کے قارئین کو ان کی زبانوں میں موزوں مطالعاتی مواد کی فراہمی پر ہوتا ہے
ایشیائی ممالک پر تو خاص طور سے یہ بات عاید ہوتی ہے جہاں نہ صرف خواندگی کی شرح میں تیزی سے اضافہ

ہو رہا ہے ملکہ قومی رسالوں کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اور انھیں سرکاری رسالوں کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی ملک میں مطالعاتی مواد کی فراہمی کا دار و مدار کتابت سے آگاہی پر ہوتا ہے جسے ایک موثر ایجنسی کی وساطت سے فروغ دیا جانا چاہیے۔ اس اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے حکومتِ پاکستان نے وزارتِ تعلیم کے تحت اس کونسل کی تشکیل کی۔ نئی تعلیمی پالیسی کے نفاذ، تعلیم کے پھیلاؤ اور خواندگی کی تحریکوں کا جرأت کے نتیجے میں ملک میں ہر قسم کی کتابوں کی ضرورت اور راستہ کئی گنا بڑھ گئی ہے جب کہ بالخصوص تکنیکی اور سائنسی تعلیم کے شعبوں کی کتابوں کی رسد اور طلب میں بڑا خلا ہے۔

چنانچہ ملک میں کتابوں اور مطالعاتی مواد میں اضافے کے لیے نئی تعلیمی پالیسی میں کئی اقدامات کیے گئے ہیں۔ اس کونسل کا قیام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ میرے دریافت کرنے پر کہ یہ کونسل عملی طور پر کیا کر رہی ہے، ناتش صاحب نے فرمایا کہ کونسل قومی کتابی ترقی کی پالیسی مرتب کر کے اس پر عمل کرتی ہے اور ساتھ ہی حکومت اور پرائیویٹ شعبوں کے متعلقہ اداروں، مصنفین، ناشرین و پرنٹرز کی پیشہ وارانہ تنظیموں کے تعاون سے منصوبہ بندی کرتی ہے۔ انھیں جو مسائل درپیش آتے ہیں انھیں حل بھی کرتی ہے۔ کونسل کی طرف سے اس کے مقاصد کے حصول کے لیے سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں۔ قومی اور عالمی سطح پر کتابوں کی نمائشیں منعقد کی جاتی ہیں اور ملک میں معیاری کتابوں کے مصنفین، پیش کاروں اور مصوروں کی حوصلہ افزائی کے لیے بک پروڈکشن ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔ کونسل نے مصنفین، بک سیلرز، ناشرین، لائبریریوں، مصوروں اور جلد سازوں کے بارے میں معلومات جمع کر کے ریسرچ ہسٹری اور ڈائریکٹری کی صورت میں شائع کیا ہے۔ کونسل کی طرف سے ایک ماہنامہ رسالہ "کتاب" شائع کیا جاتا ہے۔ قارئین کو سستی اور معیاری کتابیں فراہم کرنے کے لیے کونسل کی طرف سے ایک ریڈرز کلب بھی چلائی جا رہی ہے۔

میں نے ناتش صاحب کو بتایا کہ بھارت میں اسی طرز کے دو بڑے ادارے، اُردو پروموشن بورڈ اور نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر رسالوں کے فروغ کے لیے بھی بہت سے سرکاری ادارے ہیں۔ مختلف وزارتوں سے متعلقہ ایسے ادارے بھی ہیں جو اشاعتی پروگرام چلا رہے ہیں۔ بھارت کی مختلف صوبائی حکومتوں کے مختلف رسالوں میں ایسے ادارے ہیں جو زبان و ادب کے شعبوں میں بہت مفید کام کر رہے ہیں اور ایسے رسائل و جریدوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے جو ان اداروں کی طرف سے باقاعدگی سے شائع کیے جاتے ہیں۔

تابش صاحب نے مشہور شاعر راج نارائن راز کی زیر ادارت شائع ہونے والے بھارت سرکار کے
اردو جریدے ماہنامہ "آج کل" کا خاص طور سے ذکر کیا جو سرکاری ہوتے ہوئے بھی ایک مکمل ادبی جریدہ ہے۔
باقاعدگی، سلیقے اور بڑے ہی اہتمام سے اس کی اشاعت ہوتی ہے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اردو کے بعض
بہت بڑے ادیبوں اور شاعروں نے اس کی ادارت کے فرائض سرانجام دیے ہیں

ان دنوں میں پنجاب کے اردو قلم کار" عنوان کے تحت ایک پراجیکٹ پر کام کر رہا ہوں بہت تفصیل سے
اس کا ذکر تابش صاحب سے ہوا اس مجوزہ پراجیکٹ میں ایک حصہ پاکستانی پنجاب کے قلم کاروں کے لیے مخصوص
ہونا چاہیے، یہ میری رائے تھی جسے تابش صاحب نے نہ صرف پسند کیا بلکہ تجویز پیش کی کہ قیام پاکستان کے دوران ہی
اس موضوع پر غور و خوض کے لیے جناب احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید وغیرہ پر مشتمل ایک
خصوصی نشست رکھی جائے اس سلسلے میں انھوں نے اور بھی کئی مفید مشوروں سے نوازا، مواد کے حصول میں
مکمل تعاون کا یقین دلایا

مقبول دہلوی کسی ضروری کام سے چلے گئے تھے چند برس قبل "شمع" (نئی دہلی) کے دفتر میں میری ملاقات
جناب بخاری صاحب سے ہوئی تھی جو پیشے سے طبیب اور طبی جریدے کے مدیر ہیں اتفاق سے ان کا ایڈریس اور
فون نمبر میری ڈائری میں درج تھا۔ ان سے ملنے کی خواہش بھی تھی فون پر بات ہوئی تو انھوں نے فوراً چلے آنے
کو کہا اور میں تابش صاحب سے رخصت لے کر بخاری صاحب سے ملاقات کرنے نکل پڑا

پاکستان میں دیسی طریقۂ علاج

بخاری صاحب کے ہاں جناب ڈاکٹر طحان صاحب سے بس اچانک ہی ملاقات ہوگئی جو پاکستان کے ایک
معروف طبی سائنس داں ہیں۔

ہندوستان، پاکستان، نیپال، چین، سری لنکا اور کئی دوسرے ملکوں میں دیسی طریقۂ علاج نہ صرف
رائج ہے بلکہ کافی مقبول بھی ہے۔ دنیا کے کئی ترقی یافتہ ممالک میں بھی دیسی دواؤں اور علاج معالجے میں کافی
دلچسپی لی جا رہی ہے بھارت میں اس طریقۂ علاج کے تحت آیورویدا اور یونانی دونوں ہی آتے ہیں لیکن پاکستان میں
صرف یونانی سسٹم ہے بہت سے عرب ملکوں میں بھی اس سسٹم کو پھر سے زندہ کرنے کی کوششیں شروع کی گئی ہیں اور اسے
اسلامی طب کا نام دیا گیا ہے کیوں کہ اس کا تعلق یونانی طب سے ہے اس لیے قدرتی طور پر جناب بخاری اور ڈاکٹر طحان صاحب

اسی موضوع پر زیادہ تر گفتگو ہوئی

طبِ یونانی کی بنیاد یونان میں حکیم بقراط نے ڈالی تھی لیکن عربوں نے اسے غیر معمولی طور پر فروغ دیا اور اسے سائنسی بنیاد فراہم کی وقت کی تیز رفتار نے اس سائنس کو بعد ازاں یورپ میں منتقل کر دیا اور ایران و عرب میں اس کا کوئی نام لیوا نہ رہا یورپ میں طب یونانی کی بنیاد پر ایلوپیتھی نے جنم لیا لیکن اپنی اصل صورت میں نہ وہاں برقرار نہیں ہو سکی۔ اس کی سرپرستی کا سہرا برصغیر ہندوستان کے سر ہے خاص طور سے متعلقہ دور حکومت میں یہ خوب پروان چڑھی

ہر دوسرے دیس کی طرح ہر جگہ ایلوپیتھی کا بول بالا ہے یہی حال پاکستان میں بھی ہے لیکن وہاں طب یونانی کی کیا صورت حال ہے ـــــ اس بارے میں ڈاکٹر خان سے بات چیت کرنے کے بعد ہی مجھے کافی معلومات کا علم ہوا

پاکستان میں سرکاری سطح پر وفاقی وزارت طب کے تحت اطبا کی "نیشنل کونسل فار طب" قائم کی گئی ہے۔ قومی سطح پر وزارت پلاننگ میں طبِ یونانی کا الگ ڈائرکٹوریٹ ہے اسی طرح نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اسلام آباد میں طب کا الگ شعبہ ہے صوبہ سرحد (پاکستان) میں طب کا ایک علیحدہ ڈائرکٹوریٹ قائم ہے جس کے تحت صوبے کی ضلعی سطح پر سول ہسپتالوں میں ۴۸ اطبا (حکیموں) کو مستقل طور پر تعینات کیا گیا ہے ڈاکٹر خان کے مطابق آمدہ سال مزید ۲۱۳ ڈسپنسریاں کھولنے کی منظوری دے دی گئی ہے انھوں نے یہ بھی بتایا کہ دیگر صوبوں میں بھی جلد ہی طب کے الگ شعبے قائم کیے جا رہے ہیں

ڈاکٹر خان کے مطابق پاکستان میں گیارہ طبیہ کالج قائم ہیں جن میں ہر سال تقریباً ایک سو طالب علموں کو داخلہ دیا جاتا ہے اس وقت پاکستان میں تقریباً چالیس ہزار رجسٹرڈ یونانی حکیم ہیں اور ان میں سے لگ بھگ دس ہزار باقاعدہ تعلیم یافتہ یعنی گریجوایٹ حکیم ہیں ـــــ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں یونانی نباتی ادویہ پر پی ایچ ڈی کرائی جاتی ہے کراچی میں سرکاری سطح پر یونانی ریسرچ سینٹر اور ہسپتال قائم ہیں سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے ملازمین کو طبی سہولیات میسر ہیں یونانی ڈاکٹر تیار کرنے والے اداروں کی ایک ملک گیر پاکستان طبی مینوفیکچررز ایسوسی ایشن قائم ہے جس میں پاکستان کے تمام معیاری اور ممتاز طبی دوا ساز ادارے شامل ہیں

ڈاکٹر خان کا کہنا تھا کہ طب کے میدان میں پاکستان اور بھارت ایک دوسرے سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ایلوپیتھک دواؤں کے مضر اثرات کے بعد دنیا بھر میں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ قدرتی ادویاتی جڑی بوٹیوں سے علاج ہی میں ہماری صحت ممکن ہے یہی وجہ ہے کہ W H O نے اس ضرورت

کا احساس ہر وقت کیا ہے اور آج یورپ میں جڑی بوٹیوں کے اسٹور قائم ہیں۔ امریکہ، جرمنی اور مشرقِ وسطیٰ میں ہربل اسٹور قائم ہو رہے ہیں اور ریسرچ کا کام بھی جاری ہے۔ اسی طرح چین نے ایکوپنکچر طریقۂ علاج میں عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ لہٰذا یہ امکانات روشن ہو رہے ہیں کہ دساور کے معالجین اس قدیم جڑی بوٹیوں کے علاج کی جانب راغب ہو رہے ہیں اس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ بھارت اور پاکستان میں اس طریقۂ علاج کی طرف مل جل کر اگر توجہ دی جائے تو وہ دُنیا بھر کی رہنمائی کر سکتا ہے

ڈاکٹر جہاں اور بخاری صاحب کے ساتھ اس موضوع پر ہوئی میری گفتگو بڑی دلچسپ اور مفید رہی۔ بہت سی باتوں کا علم مجھے ہوا اور بھارت میں دیسی طریقۂ علاج سے متعلق بہت سی باتوں کی جانکاری میں نے انھیں دی ہم نے تسلیم کیا کہ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جو دونوں ملکوں کے درمیان اشتراک، مفاہمت اور دوستی کا باعث ہو سکتا ہے

بخاری صاحب کی خواہش تھی کہ وہ لاہور یا اسلام آباد میں پاکستان کے یونانی اطبا کا ایک اجتماع کریں اور میں انھیں خطاب کروں لیکن میں نے معذرت طلب کی کیوں کہ ایک تو وقت کی کمی تھی اور دوسرے پاکستان کا دورہ کرنے کا میرا بنیادی مقصد ادبی تھا۔

بشریٰ رحمٰن کا ایک اور روپ

بعد دوپہر جب میں گھر لوٹا تو پتہ چلا کہ بشریٰ رحمٰن آج صبح سے گھر پر نہیں ہیں مہینے میں ایک دن انھوں نے ایسی غریب عورتوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے جنھیں مدد کی ضرورت ہوتی ہے بشریٰ کافی بڑی تعداد میں انھیں اپنے گھر بلاتی ہیں قرآن پاک پڑھا جاتا ہے انھیں کھانا کھلایا جاتا ہے اور پھر جو بھی بن پڑے ان کی مدد کی جاتی ہے بشریٰ یہ سب کام بہت خاموشی اور باقاعدگی سے کرتی ہیں گھر لوٹنے پر میں نے دیکھا کہ بشریٰ ایسی بہت سی عورتوں کو کچھ دے کر وداع کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کی عظیم شخصیت کا ایک اور پہلو پہلی بار مجھ پر اجاگر ہوا تھا جب میں نے اس بارے میں اُن سے کچھ پوچھا تو وہ اسے یہ کہہ کر ٹال گئیں کہ ایسی باتوں کا تعلق دکھاوے سے نہیں، احساس اور جذبات سے ہوتا ہے یہ سب تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کا بہانہ ہے بشریٰ کے ان چند الفاظ نے ہی میرے تمام سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔

روزنامہ "مشرق" کے لیے انٹرویو

ابھی میں آج کی مصروفیات کے نوٹ اپنی ڈائری میں لکھ رہا تھا کہ بشریٰ نے مجھے آواز دی۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وحید احمد کو منتظر پایا بشریٰ نے تعارف کرایا ———— روزنامہ اخبار "مشرق" کے کالم نگار جناب سرور مجاز تھے مشہور شاعر جناب شاہد واسطی اور اکبر کاظمی تھے اور بطور خاص مجھ سے ملنے ملتان کا سفر کر کے تشریف لائے تھے سرور مجاز صاحب نے جو باتیں مجھ سے کیں وہ روزنامہ "مشرق" کی ۷ فروری کی اشاعت میں "ادبی باتیں" عنوان کے تحت کچھ اس طرح شائع ہوئیں

———— بھارت سے ادب کے بارہ کھلاڑیوں کی ٹیم (بھارتی ادیبوں کا سرکاری وفد) پاکستان کے بڑے شہروں میں اردو میں ہونے والے کام دھام کے سلسلے میں دس روزہ میچ کھیل کر بھارت کو پیاری ہو گئی تو معلوم ہوا اس رنگار ڈاکٹر کیول دھیر تیرہویں کھلاڑی بن کر آ گئے بیسواں دن ڈاکٹر کیول دھیر لاہوری اہلِ قلم کی محفلوں کی رونق بنے ہوئے ہیں ہمیں شاہد واسطی نے فون پر بتایا کہ بشریٰ رحمٰن اور میاں رحمٰن کے گھر ان دنوں ڈاکٹر کیول دھیر بھارت سے آئے ہوئے ہیں آپ بھی آ جائیں اکبر کاظمی صاحب بھی موجود ہیں سو ہم چلیں گے ہم نے شاہد صاحب سے کہا کہ آپ ہمیں کس خوشی میں گھسیٹ رہے ہیں میزباں سے اپنے ساتھ جانے والی ہر آلا کے بارے میں پوچھ لیا کرتے ہیں ہم نے تو بیدار ملک کو بھی یہی مشورہ دیا تھا۔

بشریٰ رحمٰن اور میاں عبدالرحمٰن کے گھر کے بارے میں ہم نے پہلے بھی بتایا تھا کہ ان کے گھر کا ماتھا ان کے گھر کے عقب میں ہے اور صدر دروازہ میں داخل ہوتے ہی "باادب باملاحظہ ہوشیار" قسم کی صدا کان خود ہی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ حیرت ہوئی کہ میاں رحمٰن اور بشریٰ کے گھر میں بھی لوڈشیڈنگ (پاکستان میں جب بجلی سپلائی میں کٹوتی لگائی جاتی ہے تو اسے لوڈشیڈنگ کہتے ہیں) نے ماحول کو آرٹسٹک بلکہ بشریٰ کے کہنے کے مطابق رومانٹک بنا رکھا تھا مگر صوفے وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ دو چار منٹ بعد بشریٰ رحمٰن نے آتے ہی صدر دروازے کی اندرونی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر "ڈاکٹر صاحب" پکارا اور فوراً ڈاکٹر کیول دھیر اپنے کمرے سے نکل کر ہمارے پاس آ گئے تعارف ہوا ملازم نے سوئی گیس کے بلب روشن کیے مگر لوڈشیڈنگ کے بعد ڈرائنگ روم کی ڈارک براؤن فضا سے ہم تینوں کا رنگ ملتا جلتا تھا ہم نے سمجھا کہ ڈاکٹر صاحب اردو اسپیکنگ قسم کے ادیب ہوں گے چنانچہ ان سے پوچھ ہی لیا کہ آپ کا تعلق یوپی یا سی پی

کس علاقے سے تعلق ہے؟ کہنے لگے ـــــ "میں تاں جناب ٹھیٹھ پنجابی ہاں میرا تعلق لدھیانے توں ہے" ... افسانہ، ناول، ڈرامہ ـــ کیا لکھتے ہیں؟ اور آپ کس شعبے کے ڈاکٹر ہیں؟"
کہنے لگے کہ میں افسانہ، ناول، ڈرامہ لکھتا ہوں اور میں نے پنجابی ادبیات میں ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ساہیوال سے بھارتی پنجاب کے قصبہ پھگواڑہ میں آباد ہوئے اور اب لدھیانہ میں رہائش ہے۔ وہ "پنجاب کے اُردو قلمکار" عنوان سے ایک کتاب تیار کر رہے ہیں جس میں پاکستانی پنجاب کے معروف قلم کاروں کو شامل کرنے کی بھی تجویز ہے۔

چنانچہ اس ضمن کے تحت ڈاکٹر صاحب نے لاہور میں پنک کونسل میں ذوالفقار تابش صاحب اور بعض دوسرے لوگوں سے بات چیت کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہماری جانکاری میں اضافہ کیا کہ بھارتی پنجاب میں اگرچہ اردو سرکاری زبان نہیں ہے تاہم محکمہ لسانیات کی طرف سے ماہنامہ "پرواز ادب" اور محکمہ تعلقات عامہ کی طرف سے ماہنامہ "پنجاب سان" شائع کیے جاتے ہیں جو معیاری اور مقبول جریدے ہیں۔
ابھی گپ شپ کا سلسلہ جاری تھا کہ معروف افسانہ نگار پروفیسر عرفان علی شاد آ گئے۔ ڈاکٹر کیول دھیر بتا رہے تھے کہ شمالی بھارت کا سب سے بڑا اخبار "ہند سماچار" ہے جس میں بشریٰ رحمٰن کے ناول چھپتے ہیں۔ بشریٰ رحمٰن کے کئی ناول بھارت کے معروف اخباروں اور جریدوں میں بالاقساط چھپ چکے ہیں۔ اکبر کاظمی کے سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نے اب تک ساٹھ کتابیں مرتب کی ہیں جن میں سے زیادہ پنجابی میں ہیں۔ اُردو میں پانچ چھ ہیں۔ ناولوں کے تو کئی کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ہند سماچار کا اُردو ایڈیشن کم از کم ایک لاکھ شائع ہوتا ہے اور تمام زبانوں (ہندی اور پنجابی) میں اس کی مجموعی اشاعت سات لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ حکومت پنجاب نے ہر ضلع میں لینگویج افسر مقرر کیے ہوئے ہیں اُردو کا کام بھی انھیں کے ذمے ہے ـــــ
ڈاکٹر کیول دھیر سے ہماری بات چیت کے درمیان بشریٰ لگاتار متوجہ رہیں۔ چائے، چاٹ، کھیر و برفی ہمارے سامنے آئی تو خاصی دیر تک منتظر رہی کہ اسے کوئی ہاتھ لگائے بھی، مگر ہم سب ڈاکٹر صاحب کی باتوں اور بشریٰ کی بیرونی سیر و سیاحت کی معلوماتی گفتگو میں ایسے گم ہوئے کہ 'کھانا پینا' کی طرف ہم کبھی کبھی ہی دیکھتے رہے۔
بشریٰ کی گفتگو کا مرکز یہ بات تھی کہ ہمارے ہاں قومی زبان و ادب میں دیکھا جائے تو قابلِ ذکر کام نہیں ہوا ـــــ اور پھر اوساکا یونیورسٹی کے ایسے جاپانی اساتذہ کا ذکر کیا جن میں سے ایک کراچی یونیورسٹی سے

اردو میں ایم اے کیا اور اوساکا میں جب اس نے شتری کو دیکھا تو حسرت کے عالم میں یوں مخاطب ہوا——
"شتری آیا! آپ کا کیا حال ہے؟" اور پھر چل سو چل ایک ہی سانس میں شتری نے اپنے سفر کے دوران کے ایسے
ایسے واقعات سنائے کہ ہمیں اپنے ملک میں اپنی قومی زبان کا ادیب یا شاعر کہلاتے ہوئے بھی ندامت کا احساس ہوا،
بہرحال ہماری خواہش ہے کہ ڈاکٹر کیول دھیر کا دورۂ پاکستان کامیاب ہو اور بھارت میں ہی کیا
دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی شتری کے افسانوں، ناولوں ہی نہیں بلکہ ان کی گفتگو کے بھی تراجم چھپ جائیں ——"

رُتوں کے درمیاں کا شاعر شاہد واسطی

"رُتوں کے درمیاں" شاہد واسطی کا شاعری مجموعہ ہے جس کی جلد انھوں نے بہت خلوص کے ساتھ
مجھے پیش کی وہ مراد آباد کے رہنے والے ہیں جنم کی مٹی کی بو باس ان کی باتوں میں مہکتی ہے ادارہ حبیب بینک
لمیٹڈ پاکستان میں وہ اسسٹنٹ وائس پریذیڈنٹ کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں شخصیت سادہ اور
سنجیدہ ہے لیکن پُرکشش، حساس طبیعت میں ایک عجیب سی تڑپ پنہاں ہے ممتاز ادیب جناب مراد نے
شاہد واسطی کا ذکر کرتے ہوئے بہت صحیح لکھا ہے کہ —— "شاہد کے ہاں وہ حساسیت بڑی واضح محسوس
ہوتی ہے جو ایک ایسے شخص کے ذہنی کرب سے عبارت ہے جس کا متحمل اس دور میں سانس لینے والا ایک انتہائی
حساس ذہن ہی ہو سکتا ہے۔" ملاحظہ ہو شاہد واسطی کے چند اشعار ——

اُڑا ہوں دُور تک گولیوں کی بارش میں
لہو کی جھیل سے نکلا ہوا پرندہ ہوں،

ہو مل سکے تو مروت کے ساتھ مل ورنہ
تعلقات کے دوزخ میں مت جلا مجھ کو

ذرا پیڑ کٹنے سے پہلے ہی سوچو!
پرندے کہاں پھر بسیرا کریں گے

تمھیں گلی میں کھڑے بانسوں سے خطرہ تھا
گھٹائیں ٹوٹ کے برسیں ہمیں مکانوں پر

جوان جوان کہانیوں کا خالق عرفان علی شاد

عرفان علی شاد دیر سے آئے تھے بات چیت میں شریک تھے لیکن اُن سے کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی سرور مختار ساجد واسطی اور اکبر کاظمی کے رخصت ہونے کے بعد بشریٰ نے عرفان علی شاد کا باقاعدہ اور مفصل تعارف کرایا"۔۔۔ ۔ عرفان نوجوان ہیں، خوش شکل ہیں اور جوان و خوب صورت کہانیاں لکھتے ہیں۔" لوڈ شیڈنگ کے باعث ابھی تک ہم گدمی روشنی میں جیسے ایک دوسرے کی پرچھائیاں دیکھ رہے تھے اس لیے اندازہ نہیں ہو سکا کہ عرفان علی شاد کے چہرے پر بشریٰ کے ان الفاظ کا کیا ردّ عمل پیدا ہوا لیکن میرا اندازہ ہے کہ عرفان شرمائے نہیں ہوں گے، خوش ہوئے ہوں گے۔ روشنی تیز ہوتی تو یقیناً عرفان شرما جاتے اندھیروں اور روشنیوں کے درمیان شرمانے اور مسکرانے جتنا ہی فرق ہے افسانے کی بات ہونے لگی تو عرفان نے کہا ۔۔۔ "میں آپ کے قلم کا مدّاح ہوں ۔۔۔ بیسویں صدی، شمع اور بعض دوسرے رسالوں میں بچپن ہی سے آپ کی کہانیاں پڑھتا آ رہا ہوں۔" بشریٰ نے پھر ٹوک دیا ۔۔۔ "عرفان ایسا ظلم مت کیجیے ۔۔۔ ڈاکٹر صاحب ابھی بوڑھے نہیں ہوئے ۔۔۔" عرفان پہلی مرتبہ کھل کر بولے ۔۔۔ "روشنی آئے تو پتہ چلے ۔۔۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں بہت برسوں سے ڈاکٹر صاحب کا قاری ہوں۔" گدمی روشنی کی آڑ میں آپس میں الفاظ کی سرگوشیاں جاری رہیں اور جلد ہی جب روشنی ہو گئی تب باتوں نے شرارتیں کرنا چھوڑ دیا اور ہم افسانے کے موضوع پر سنجیدہ باتیں کرنے لگے۔

عرفان علی شاد سچ مچ جوان کہانیوں کے خالق ہیں یہ احساس میرے من میں تب جاگا جب میں نے اُسی شب عرفان کے اس افسانوی مجموعے سے چند کہانیاں پڑھیں جو بہت محبت سے وہ مجھے دے گئے تھے

عرفان کے وجود میں بسے اس انسان کو میں نے اپنے بہت قریب محسوس کیا جس نے کبھی لکھا تھا۔۔۔ "رنجشیں کب ختم ہوں گی، بارود کے دھوئیں سے فضا کب پاک ہو گی؟ انسان انسان کو کب گلے لگانے لگا؟ کب پوری دنیا کے لوگ ایک دوسرے سے کہیں گے کہ ہم ایک دوسرے کے بھائی ہیں، ہم ایک ہی ڈال پر بیٹھے والے پنچھی ہیں، ہم نے ہتھیار پھینک دیے ہیں اور محبت کرنا سیکھ لیا ہے ۔۔۔ آخر یہ بول انسان کی زبان سے کب ادا ہوں گے؟"

عرفان ایک کھرے، سچے اور محنتی انسان ہی نہیں ایک بے باک قلم کار بھی ہیں کھارب ہوپایا کہ
ادبی گروہ بندیوں کا شکار ہو لوں دیتیں ہیں ہر جگہ، ادبی آقا موجود ہیں جو راتوں رات ایک ایسے آدمی کو
عظیم شاعر یا ادیب بنا دیتے ہیں جسے ابھی قلم پکڑنا بھی نہیں آتا جو کسی ادبی آقا کے گروہ کا شکار نہیں کر عیر
جانب داری اور ایمان داری سے لکھا چلا جاتا ہے۔ زندگی بھر وہ اسی بیہیاں کے لیے رستا رہتا ہے
ـــــ "- - - - ہم مختلف دھڑوں میں
عرفان نے پاکستان کی ادبی گروہ بندیوں کا ذکر یوں کیا ہے ـــــ
بٹے ہوئے ہیں ہم صرف اور صرف اپنا نام چمکانا چاہتے ہیں خواہ وہ نام ادب کے کسی ٹھیکیدار کے پاؤں دبا کر
حاصل ہو یا کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی (ادبی) میں نعرے بازی کر کے ملے افسوس کہ ہم نے ادب کو سیاست
بنا لیا اور آپس میں ہی لڑنے لگے ـــــ ہم آئے دن ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں ایک
دوسرے کو گرایا جاتا ہے گویا ادب نہ ہوا کوئی اکھاڑہ ہو گیا ـــــ ان باتوں کے باوجود اگر ہم یہ کہیں کہ
ہم شاعر ہیں، ہم افسانہ نگار ہیں، ہم معاشرے کے نباض ہیں تو ہمیں ایسا کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے "
عرفان ایسے کھرے سچے انسان اور جوان جوان کہانیوں کے خالق سے بھلا کیسے محبت نہ ہوگی ،
کھانے کے بعد چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بشریٰ عرفان کے بارے میں بتاتی رہیں، اس کی کہانیوں
کی باتیں کرتی رہیں اور اس کے ایک اچھا انسان ہونے کے وصف گنواتی رہیں۔ اسی دوران لالہ موسیٰ سے جناب
احمد مسعود شیخ تشریف لے آئے اس سے قبل کبھی کراچی کبھی راولپنڈی اور کبھی ملتان سے فون پر وہ مجھ سے
رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ وہ مجھ سے ملاقات کرنے کے خواہاں تھے جب وہ آئے تو بے شمار
تحائف سے لدے ہوئے تھے اور آتے ہی یہ تحائف انھوں نے بشریٰ اور مجھ میں بانٹ دیے اس دبلے
پتلے نوجوان میں جذبات کی شدت تھی، دل میں ولولے تھے، آواز میں جوش تھا اور تب گیارہ بجے جب
وہ رخصت ہوئے تو میرے دل و دماغ پر اُن کی محبت کا نشہ طاری تھا

"وطن دوست" کے دفتر میں

۲۱ جنوری کی صبح فون کی گھنٹی سے بیدار ہوئی دوسری طرف مجھ سے مخاطب آواز جناب سردار احمد
کی تھی جو روزنامہ "مشرق" کے سینئر رپورٹر ہیں اور مسز اسٹریو پولیسی کی جو اس سے مجھے ملانا چاہتے تھے "وطن
دوست" نام سے بشریٰ کا ذاتی اشاعتی ادارہ ہے اور اس کا ایک سالنامہ بھی ہے۔ پروگرام کے مطابق

آج ہمیں صبح ہی 'وطن دوست' کے دفتر جانا تھا سرفراز احمد صاحب کو میں نے دفتر چلے آنے کو کہا اور میری درخواست کو انھوں نے قبول کرلیا۔

'وطن دوست' کے دفتر میں طاہرہ، قدسیہ اور رضی الدین رضی سے پہلی بار ملاقات ہوئی طاہرہ اور قدسیہ دفتر کا کام سنبھالتی ہیں رضی بھی دفتر میں بیٹھتے ہیں اور نشتری کے سیکریٹری کے فرائض سرانجام دیتے ہیں نشتری نے ان تینوں سے مجھے متعارف کرایا یہ ایک کاروباری ادارے کا دفتر تھا لیکن یہاں کا ماحول مجھے گھر جیسا ہی لگا نشتری کی بات چیت اور برتاؤ ان سے دوستانہ تھا اور ان کے ہر کام اور ہر بات میں نشتری کے لیے بے پناہ چاہت تھی اسی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر نشتری اگرچہ روز ہی دفتر آنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہاں ان کی آمد محض سرسری معائنے جیسی ہوتی اور ہدایات دے کر وہ پھر اپنی مصروفیات میں کھو جاتیں طاہرہ، قدسیہ اور رضی ان کی غیر حاضری میں دفتر کا کام کاج بخوبی چلا رہے تھے۔

میں نے ہندی اور پنجابی رسالوں میں بھارت سے نشتری کے نام آئے ان خطوط کو پڑھنے کا وعدہ کیا تھا جو ان کے قارئین نے انھیں لکھے تھے اور جس میں بے پناہ محبت کا اظہار تھا ——— جذبات کی گرمی تھی ———۔

میں جب خط پڑھ رہا تھا تو نشتری کے چہرے پر اُن جذبات کے ردِّ عمل کو بھی دیکھ رہا تھا جو کہیں دل کی عمیق گہرائیوں میں پیدا ہو کر اُن میں ہلچل مچا رہے تھے بار ہا اُن کی آنکھیں نم ہوئی تھیں ——— اور یہ بھی اس محبت کے ردِّ عمل کی تھی جو سینکڑوں ہزاروں میل دُور بیٹھے ان کے لاتعداد قارئین نے انھیں دی تھی میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ ہم لکھنے والوں کی برادری میں کتنی نشتری ہیں جنھیں اپنے پڑھنے والوں کی اسی گہری اور جذباتی محبت، اپنائیت اور خلوص کی دولت نصیب ہوئی ہو؟ سچ مچ نشتری عظیم ہیں ——— نشتری اس دَور کی مقبول ترین ادیبہ ہیں ——— نشتری ——— نشتری ہیں!

اسی دوران مقبول احمد دہلوی آگئے اور اسی دوران قدسیہ نے گرم گرم چائے، کیک، پیسٹری، بسکٹ، سموسے اور یہ جانے کیا کیا لوازمات سے سامنے بڑا میز بھر ڈالا تھا، 'مشرق' کے سینئر رپورٹر جناب سرفراز احمد بھی تشریف لے آئے چائے کے ساتھ ساتھ میں سرفراز کے سوالوں کا سامنا بھی کرتا رہا اور وہ میرے جوابات کو اپنے قلم سے قید کرتے رہے طاہرہ اور قدسیہ نے باری باری کیمرہ سنبھالے رکھا اور بار بار فلیش کی چمک سے آنکھیں چندھیاتی رہیں۔

«دلی دوست» کے دفتر سے جب ہم روانہ ہوئے تو دوپہر کی دھوپ ڈھل رہی تھی مقبول دہلوی
جو میرے ہمراہ تھے مجھے اردو بازار لے گئے مجھے کچھ کتابیں لینی تھیں اور اس بہانے لاہور کے کئی ملنسار
سے ملاقات کا موقع بھی مل گیا مقبول نے جس کسی پبلشر سے بھی میرا تعارف کرایا وہ مجھے بڑی محبت احترام
اور گرمجوشی سے ملے۔ جو کتابیں مجھے درکار تھیں ان لوگوں نے بطور تحفہ پیش کیں

اردو پبلشرز سے ملاقاتیں

اردو پاکستان کی قومی زبان ہے بول چال کی زبان بھی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ وہاں اردو
کتابوں اور جریدوں کی اشاعت کافی ہوتی ہے کتابوں کی اشاعت اور فروخت کے بارے میں مختلف
پبلشرز سے ملنے کے بعد جو تاثر میں نے لیا وہ اس طرح ہے

پاکستان میں اردو کتابیں ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ شائع ہوتی ہیں ان کا اشاعتی معیار
بھی عام طور پر ہندوستانی کتابوں سے بہتر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں طباعت کا سارا کام جدید
طرز کی آفسٹ مشینری اور نئی تکنیک سے کیا جاتا ہے ہندوستان کے مقابلے میں وہاں کتابت کی بہتر
سہولیات میسر ہیں لیتھو پر چھپی کوئی کتاب میں نے وہاں نہیں دیکھی جب کہ ہندوستان میں آج بھی
بہت سی اردو کتابیں لیتھو پر ہی چھپتی ہیں آفسٹ پر بھی چھپتی ہیں لیکن ان کی تعداد نسبتاً کم ہے
چند باتیں مشترک ہیں یعنی پاکستان میں بھی ہندوستانی کتابوں کی طرح قیمت کافی زیادہ ہوتی ہے اور ان
کی ایک ایڈیشن کی اشاعت بھی پانچ سو سے لے کر ایک ہزار تک ہے۔ وجہ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ عام قاری
اتنی مہنگی کتابیں نہیں خرید پاتا اور نہ لائبریریوں کی گرانٹ ملتی ہیں بھارت کے مقابلے میں
وہاں کتابوں کی سرکاری خرید زیادہ ہوتی ہے۔ ایک نمایاں فرق ضرور ہے کہ بھارت میں زیادہ تر کتابیں
قلم کار اپنے خرچ پر شائع کرتا ہے جب کہ پاکستان میں قلم کار کی جیب پر بوجھ نہیں پڑتا اور عموماً
پبلشر مل جاتا ہے۔ بہت بڑے ناموں اور بڑے اداروں کی کتابوں کی اشاعت اور فروخت دونوں
ملکوں میں ایک جیسی ہی ہے یعنی ایسی کتابیں ناشر کی طرف سے شائع کی جاتی ہیں اور بکتی بھی ہیں۔
بھارت میں پاکٹ بکس کا رواج بہت زیادہ ہے جب کہ پاکستان میں کوئی ایک کتاب بھی
پاکٹ بکس میں نہیں چھپتی۔ اس کی وجہ شاید وہ ڈائجسٹ ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور کم قیمت پر

یہ کافی مواد قاری کو مہیا کرتے ہیں اس کے برعکس ہندوستان میں ڈائجسٹ قسم کے جریدوں کی تعداد نہیں کے برابر ہے۔

ایک بات جو خاص طور پر میں نے نوٹ کی وہ یہ ہے کہ پاکستان میں دوسرے یا تیسرے درجے کی کتابوں کی اشاعت کافی بڑی تعداد میں ہوتی ہے اس سے میری مراد ایسا ادب ہے جو عام قاری کے جذبات میں ہلچل مچا سکتا ہے اور وہ اُسے پڑھتا ہے بعض لوگ اسے فحش لٹریچر کا نام بھی دیتے ہیں اس زمرے کی کتابیں دو طرح کی ہیں ایک تو وہ جو رومانی ہیں اور ادب کے معیار پر پوری نہیں اُترتیں لیکن ان پر فحاشی کا الزام نہیں لگتا اور کھلے عام بکتی ہیں دوسرے زمرے کی کتابیں فحش ہوتی ہیں جو پاکستان میں چھپتی ہیں لیکن کھلے عام فروخت نہیں ہوتیں ان دونوں زمروں کی کتابیں عرب ممالک میں بے تحاشا فروخت ہوتی ہیں جو قانونی اور غیر قانونی دونوں طرح سے پاکستان سے جاتی ہیں اسلامی، نصابی، طبی، سائنسی موضوعات پر بھی کتابیں وہاں بھیجی اور فروخت ہوتی ہیں۔ یوگا اور صحت کے موضوع پر بھی پاکستان میں کتابوں کی کھپت ہوتی ہے۔

بھارت اور پاکستان دونوں ہی دیشوں میں بلا اجازت کتابوں کی اشاعت کی بیماری عام ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان اس طرح کا کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا جس کے تحت کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں ملتی یا ادیب کی منظوری لینا لازمی ہو۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ میری کئی کتابیں پاکستان میں اسی طرح شائع کی جارہی ہیں جن پر پبلشر کا نام تک بھی تبدیل نہیں کیا گیا قلم کار کے ساتھ یہ بہت بڑا ظلم ہے دونوں ممالک کی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ کوئی ایسا معاہدہ کریں جس کے تحت اس طرح کی چوری اور سینہ زوری کو روکا جاسکے اور قلم کار کے حقوق کا تحفظ ہوسکے۔

لاہور اکادمی میں جناب سردار محمود سے ملاقات

لاہور اکادمی میں ایک ماہر جناب سردار محمود سے ملاقات اور تفصیلی بات چیت ہوئی میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ سردار محمود مشہور ممتاز اردو شاعر و ادیب مرحوم احسان دانش کے چھوٹے بھائی ہیں ماہنامہ "حنا" کے ایڈیٹر و پبلشر ہیں اور ایک بڑے اشاعتی ادارے کے مالک ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ بہت ملنسار، خوش مزاج اور خلیق انسان ہیں ان کا تعلق بھارتی پنجاب سے ہے ان کی پیدائش ضلع جالندھر کے قصبہ تحصیل پھلور کی ہے بات چیت کے دوران سردار محمود اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ

کرتے رہے لُدھیانہ کی سڑکوں، گلیوں اور محلّوں کی باتیں کرتے رہے جہاں انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ یکس اور حوالی کا آثار دیکھا اور محسوس کیا تھا اور پھر ملکی تقسیم کے ساتھ ہی وہ اسی دھرتی سے پرائے ہو کر ایک دوسرے نئے دیس کے باسی ہو گئے تھے تقسیم سے بھارت اور پاکستان دو الگ الگ ملکوں کا وجود قائم ہوا تھا لیکن دھرتی سے رشتے ٹوٹتے نہیں جذباتی طور پر سردار محمود کا اسی جنم کی دھرتی سے رشتہ قائم ہے۔

بات چیت کے دوران ہی پاکستان کے مشہور محقق اور قلم کار جناب ڈاکٹر محمود زکریا صاحب تشریف لے آئے۔ ان سے جان پہچان ہوئی، ادب پر مختصر بات چیت ہوئی لیکن تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی کیوں کہ شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے اور پاکستان کے قدآور مشہور ادیب جناب احمد ندیم قاسمی سے طے ہوا ملاقات کا وقت ہو رہا تھا سردار محمود سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے اور ڈاکٹر زکریا سے اجازت طلب کر کے میں اور مقبول احمد دہلوی وہاں سے چل پڑے۔

مُلاقات احمد ندیم قاسمی سے

پُرانی وضع قطع کی عمارت میں "فنون" کا دفتر ہے۔ "فنون" پاکستان کے چند اہم ادبی جریدوں میں سے ایک ہے اور اس کے مدیر جناب احمد ندیم قاسمی ہیں اُردو ادب میں احمد ندیم قاسمی اور فنون کا قد بڑا اور بہت اونچا ہے۔ جب ہم دفتر میں داخل ہوئے تو وہاں ندیم صاحب کے پرستاروں، شاعروں اور ادیبوں کا مجمع سا لگا ہوا تھا لیکن خود ندیم صاحب غائب تھے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ ندیم صاحب کسی تقریب میں شرکت کرنے گئے ہیں اور بس ابھی آنے ہی والے ہیں۔ ان کی غیر حاضری میں وہاں موجود حضرات خوش گپیوں میں مصروف تھے اور ہم ان کی عیارانہ باتوں سے محظوظ ہوتے رہے پندرہ بیس منٹ انتظار کرنے کے بعد جب جناب احمد ندیم قاسمی دفتر میں داخل ہوئے تو وہاں موجود تمام لوگ ان کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے ______ مکمل خاموشی چھا گئی۔ اچانک مجھے کسی مدرسے کی کلاس کا وہ منظر یاد آ گیا جس میں استاد کلاس میں داخل ہوتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے اور بچے اپنے استاد کی تعظیم میں کھڑے ہو جاتے ہیں یہاں یہ منظر زندہ جاوید میری آنکھوں کے سامنے تھا مقبول احمد دہلوی نے احمد ندیم قاسمی صاحب سے میرا تعارف کرایا تو ماحول میں کچھ تبدیلی آ گئی تب قاسمی صاحب نے میرا تعارف وہاں موجود تمام لوگوں سے کرایا جن میں سے اکثر کے نام

مجھے یاد نہیں ہیں) جیسا کہ میں نے عرض کیا، اردو ادب میں احمد ندیم قاسمی ایک بڑا نام ہے اور مجھ جیسے غیر معروف افسانہ نگار کے بارے میں ان کی جانکاری ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن حیرت ہوئی کہ ان کے ذہن میں میں کہیں محفوظ ہوں ورنہ میرا تعارف کراتے وقت وہ یہ نہ کہتے ——— "... ڈاکٹر کنول دھیر صاحب بھارت کے ایک معروف افسانہ نگار ہیں ——— ہم انہیں خوش آمدید کہتے ہیں ———۔"

ماحول ایسا نہیں تھا کہ احمد ندیم قاسمی صاحب سے کسی طرح کی کوئی سنجیدہ بات چیت ہو سکتی بہت سے لوگوں کی موجودگی میں سرسری باتیں ہوئیں گلدستہ دینوں پاکستان کے دورے پر آئے بھارتی ادیبوں اور ان کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر ہوا میری ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ ہوا ——— اور بس!

اچانک وہاں عطاء الحق قاسمی صاحب تشریف لے آئے۔ ہر سال امالہ (بھارت) میں مسٹر طاہورہ کی سرپرستی میں عظیم الشان انڈو پاک مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے منتظمین کی طرف سے اس مشاعرے میں شرکت کے لیے پاکستان کے ممتاز شعراء کو دعوت دی جاتی ہے اس برس جن شاعروں کو دعوت نامے بھیجے گئے تھے ان میں عطاء الحق قاسمی کے علاوہ جناب احمد ندیم قاسمی کا نام بھی شامل تھا دس کے شماروں کے بعد جناب احمد ندیم قاسمی کبھی بھارت نہیں آئے تھے دوستوں کی کوشش اور خواہش تھی کہ اگلے برس وہ مشاعرے میں شرکت کے بہانے بھارت کا دورہ کریں۔ عطاء الحق قاسمی اسی سلسلے میں اس وقت حاضر ہوئے تھے لیکن احمد ندیم قاسمی اپنا پاسپورٹ کہیں رکھ کر بھول گئے تھے

"جدید منکر" کا مصنف عطاء الحق قاسمی

عطاء الحق قاسمی کی شخصیت ایک دم طوفانی قسم کی ہے وہ طوفان کی مانند آئے اور آندھی کی طرح چل دیے اور ساتھ ہی مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چلے۔

"آؤ ——— بیٹھو ———" اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے عطاء الحق قاسمی بولے

"لیکن چلنا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جہنم میں جانے کا ارادہ ابھی نہیں ہے ——— بس تھوڑی دیر گھومیں گے ——— باتیں کریں گے" اور ایک قہقہہ لگاتے ہوئے انھوں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی شام ڈھل چکی تھی میرے

روشنیوں نے شب کی آمد کو اُجلا کر دیا تھا اور ان اجالوں کے سمندر میں ہم دونوں لاہور کی سیاہ سڑکوں پر گھومتے رہے ـــــ باتیں کرتے رہے ـــــ مقصد گھومنا کم اور باتیں کرنا زیادہ تھا لیکن عطاؔ کو شاید جیتی جاگتی، زندہ زندگی سے جنوں کی حد تک عشق ہے اُن کے قلم میں، جذبات میں، ذہن اور زبان میں نے پناہ حرکت ہے ـــــ اور شاید یہی حرکت ایک بھرپور زندگی کی علامت ہے عطاء الحق قاسمی ـــــ جس الفاظ کا نام ہی نہیں ـــــ وہ ایک ماہر جرّاح ہیں جو اپنے قلم کے نشتر سے بڑے سے بڑا آپریشن کچھ یوں کر جاتے ہیں کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ـــــ لیکن دوسرے ہی لمحے محسوس ہوتا ہے کہ بہت کچھ ہو چکا ہے اُن کے الفاظ کا طنز دھیمے سے دل میں اُترتا ہے چبھن کا احساس دلا کر جیون کرتا ہے اور پھر مسکرانے کے لئے مجبور کر دیتا ہے طنز و مزاح کی یہ کامیاب آمیزش بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے مختلف مسائل ان کی قلم کی زد میں آئے ہیں اور اپنے اس مخصوص انداز میں انھوں نے نشتر زنی کی ہے

"حدِ مکرّر" عطاء الحق قاسمی کی نئی کتاب ہے جس میں انھوں نے بہت چھوٹے چھوٹے طربیہ خاکے درج کئے ہیں ـــــ اور نہایت کامیابی سے زندگی کے مختلف مسائل کی جانب توجہ کیا ہے

عطاء الحق قاسمی لاہور کے ایک مقامی کالج میں پروفیسر ہیں ـــــ روزنامہ "نوائے وقت" کے ادبی سیکشن کے انچارج ہیں، اور مشہور کالم نگار اور مقبول شاعر ہیں اس سے بڑھ کر وہ ایک کھلے دل و دماغ والے سادہ انسان ہیں ان کی جسم عمومی امرتسر ہے اور ان کی شخصیت میں ہمیشہ ایک مکمل اور بھرپور پنجابی ہونے کی زندہ پہچان ملتی ہے

یہاں عطاءکا ایک کالم آپ کے لئے پیش کر رہا ہوں جو سعدیونیوں کے حسبِ حال ہونے کی نشاندہی کرتا ہے اور جو اپنے متوسط طبقے کے لوگوں کو مسائل کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے مجبور کرتا ہے

ـــــ دو سعدیونیس آپس میں باتیں کر رہے ہیں ـــــ !

"اوسط درجے کا مکان بھی تعمیر کیا جائے تو کم از کم ڈیڑھ لاکھ روپے لگتے ہیں"

پھر تم نے کیا سوچا؟"

"ساٹھ ہزار روپے ہاؤس فنانس کارپوریشن والوں سے قرض لے لوں گا"

"اور باقی؟"

"تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے کی مالیت کے زیورات ہیں کچھ قرض پر زمین رہن رکھنے کی صورت میں مل جائے گا۔"

"دس ہزار ہو گئے ـــــــ باقی؟"

"سکوٹر بیچ دوں گا۔"

میں نے سکوٹر کی ہیئت کذائی پہ نظر ڈالی اور کہا ـــــــ "دو ہزار روپے ـــــــ باقی؟"

اس کے چہرے پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں اور پھر اس نے چٹکی بجا کر کہا ـــــــ "کچھ رقم تم سے قرض لے لوں گا۔"

"ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا ـــــــ "سو روپیہ ہو گا ـــــــ باقی؟"

"تم ٹوٹل لگاؤ" اس نے بیزار ہو کر کہا۔ "پہلے دیکھیں یہ رقم کتنی بنتی ہے؟"

"بہتر ہزار ایک سو۔"

"مزید کتنی رقم درکار ہے؟"

"ٹھیک ہے انتظام ہو جائے گا۔" اس نے اچانک پُر اُمید ہو کر کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"میں لائف انشورنس کرا لوں گا۔"

"مگر اس سے مکان کیسے بنے گا؟"

"بن جائے گا" اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا ـــــــ "انشورنس کرانے کے بعد میں خودکشی کر لوں گا میں نہیں تو میرے بچے اپنے مکان میں رہیں گے۔"

اب آپ ہی اندازہ لگائیں کہ عطا قلم کا جادوگر ہے یا نہیں، وہ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا جاتا ہے ان باتوں میں ملک کا درد بھر دیتا ہے ـــــــ دل بیک وقت روتا اور ہنستا چلا جاتا ہے لیکن قاری سمجھ نہیں پاتا کہ پہلے وہ ہنسے یا روئے۔ اسٹور صحافی عطاء الحق قاسمی پاکستان میں بے حد مقبول ہیں اور ان کے کالم وہاں بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ عطاء الحق قاسمی مجھے ساتھ لیے اپنی گاڑی میں بہت دیر تک لاہور کی سڑکوں پر گھومتے رہے ـــــــ دل کھول کر باتیں کرتے رہے اور پھر ہم دونوں گھر یعنی لٹریری

کے ملنے پر پہنچ گئے عطا رحمٰن صاحب کے دوستوں میں سے ایک ہیں لیکن رحمٰن صاحب اس وقت گھر پر نہیں تھے نسرین موجود تھیں اور ایک بار پھر ہم محفل جما کر بیٹھ گئے۔ ہمیشہ کی طرح نسرین کی باتوں کا مزا تو حاصل ہوا ہی ــــــ عطاء الحق قاسمی کے قہقہوں، مسکانوں اور مسکراہٹوں کا لطف بھی ملا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس کی سادہ شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا

نسرین رحمٰن کی تقریریں

عطاء الحق قاسمی تب نو بجے کے قریب چلے گئے اور رات کے کھانے سے فارغ ہو کر نسرین ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ بہت سے کیسیٹ اٹھا لائیں۔ ان میں مختلف مواقع پر کی گئی نسرین کی تقریریں تھیں۔ نسرین کی تحریریں خوب صورت ہوتی ہیں ــــــ اُن کی باتیں دلچسپ ہوتی ہیں ــــــ یہ تو ہم پہلے ہی جانتے تھے لیکن اُن کی تقریریں پُرجوش، ولولہ انگیز اور بامقصد ہوتی ہیں، یہ راز ہم پر ٹیپ ریکارڈر نے افشا کیا تھا۔ ویسے سیاسی لوگوں کی تقریریں سننے میں ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔ تقریر کرنے والا سیاسی لیڈر بھلے ہی ہمارا دوست کیوں نہ ہو، ہم اس کی تقریر سننے کے لیے جلسے جلوسوں میں شامل نہیں ہوتے لیکن آج زندگی میں پہلی بار ہم نصف شب تک نسرین کی ٹیپ کی ہوئی تقریریں سن کر لطف اندوز ہوتے رہے کیوں کہ ہمیں کچھ یوں محسوس ہوا کہ ہم نسرین کی زبانی ان کی کوئی کہانی سن رہے ہیں اُن کی شخصیت کا ایک اور پہلو تھا جس نے ہمیں مزید متاثر کیا تھا۔

نقوش کے دفتر میں

۲۲ جنوری ــــــ لاہور میں میرے لیے مصروف ترین دن تھا۔
ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر باہر نکلنے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف "نقوش" کے مدیر جناب محمد طفیل کی دھیمی دھیمی آواز تھی۔ وہ کہہ رہے تھے ــــــ "کل آپ دفتر میں تشریف لائے لیکن میں کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا ــــــ ملاقات نہیں ہو سکی۔ کسی وقت آج تشریف لائیں ــــــ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !" میں نے دفتر آنے کا وعدہ کر لیا اور مجھے پچھلے دنوں دہلی میں ایک "بڑے ادیب" سے ہوئی بات چیت یاد آگئی۔ وہ صاحب ابھی ابھی لاہور ہو کر آئے تھے اور طفیل صاحب

کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ "طفیل صاحب پہلے جیسے نہیں رہے۔ اب وہ بہت بڑے ادیب اور بہت مالدار آدمی ہو گئے ہیں۔ لوگوں سے بہت کم ملتے ہیں، دو چار منٹ سے زیادہ بات نہیں کرتے، اُن میں غرور آ گیا ہے ـــــ وغیرہ وغیرہ"۔ طفیل صاحب سے کبھی میری ملاقات نہیں ہوئی تھی، کوئی جان پہچان بھی نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود اُن سے ملنے کی شدید خواہش تھی، دہلی کے اُن "بڑے ادیب" کی بات ذہن میں تھی جب کل میں اُن سے ملنے "نقوش" کے دفتر گیا تھا ـــــ اور آج میرے ذہن میں طفیل صاحب کے وہ الفاظ گونج رہے تھے جو ابھی ابھی انھوں نے یوں ہی کہے تھے ـــــ اور لمحے بھر میں تمام خدشات دُور ہو گئے تھے۔ ادب کی دُنیا کا ایک عظیم انسان اور عظیم ترین رسالہ "نقوش" کا مدیر محمد طفیل خود ہی مجھے دعوت دے رہا تھا ـــــ!

طفیل صاحب کی باتیں

اور جب قبل از دوپہر مقبول احمد دہلوی کے ہمراہ میں طفیل صاحب سے ملنے اُن کے دفتر پہنچا تو اُن کی پیاری پیاری شخصیت نے لمحوں لمحوں میں ہی مجھے موہ لیا۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ طفیل صاحب بولتے کم اور سنتے زیادہ ہیں۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے لیکن آج حالت اس کے برعکس تھی۔ دھیمی اور میٹھی آواز میں وہ کہے جا رہے تھے اور میں سنے جا رہا تھا۔ انھوں نے "نقوش" کے سفر کی کہانی کہی، اس طویل جدوجہد اور محنت کی داستان سنائی جو اس عظیم جریدے کو اس مقام پر پہنچانے میں انھوں نے کی ہے۔

"نقوش" اُردو کا منفرد ادبی جریدہ ہے جسے ۱۹۴۹ء کے نصف آخر میں احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور نے جاری کیا تھا۔ بعد میں جناب وقار عظیم اس سے وابستہ ہو گئے۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں طفیل صاحب نے اسے سنبھالا اور اپنی زندگی کا ایک نیا دور شروع کیا۔ اُردو میں بے شمار رسالے نکلے لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آج تک کوئی ایسا رسالہ نہیں نکلا جو ادب کی اور تاریخ ادب کا حصہ بن گیا ہو۔ "نقوش" ہمیشہ ایک خاص نمبر کی صورت میں شائع ہوا یا یوں کہیے کہ مسلسل اعلیٰ معیاری اور ضخیم خاص نمبروں کی اشاعت "نقوش" کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ ادبی موضوعات پر اور ادبی شخصیات پر طفیل صاحب نے لاجواب خاص نمبر شائع کرنے کے علاوہ سرد جنگوں میں اس کا رسول نمبر شائع کر کے

بہت بڑا کام کیا ہے۔

فضل صاحب کی رسمی تعلیم کچھ زیادہ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی بطور کاتب (خوش نویس) شروع کی اور محنت، لگن اور ذہانت سے بلند مقام حاصل کیا ہے وہ بطور خاکہ نگار ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں خاکوں پر مشتمل ان کی سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں انھوں نے اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں پر نہایت دل چسپ خاکے تحریر کیے ہیں۔ ان میں ان کے دوست بھی ہیں اور ملنے والے بھی ان کے خاکوں میں زندگی کی ایسی دل آویز اور دل کش پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں جن کو پڑھے بغیر انسان رہ نہیں سکتا۔ ان کی زبان سلیس، دل کش اور جان دار ہے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی پتے کی باتیں کہی گئی ہیں یہ فضل صاحب کی فنی مہارت ہے۔

پُر تکلف چائے اور بے تکلف باتوں کا سلسلہ لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا اجازت میں نے ہی طلب کی کیوں کہ آج کی مصروفیات کی فہرست کافی طویل تھی وداع ہونے لگے تو انھوں نے "نقوش" کے لیے افسانہ لکھنے کا حکم صادر فرمایا اور رسالے کے چند خاص نمبروں کے علاوہ اپنی کتابیں بھی بہت خلوص اور محبت کے ساتھ مجھے پیش کیں۔ یہ دونوں باتیں میرے لیے اعزاز سے کم نہ تھیں۔

بیگم صدیقہ اور اطہر جاوید سے مُلاقات

جناب سرور تونسوی مدیر ماہنامہ "شانِ ہند" (نئی دہلی) میرے محترم دوست ہیں پاکستان میں اپنے چند عزیز دوستوں کے نام انھوں نے پیغامات پہنچانے کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی اس سے سبک دوش ہونے کے بعد مقبول دہلوی مجھے ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر جناب اطہر جاوید کے دفتر لے گئے ماہنامہ "ادبِ لطیف" بھی یہیں سے شائع ہوتا ہے ان دونوں رسالوں کی مدیرِ اعلیٰ اور مالکہ صدیقہ بیگم ہیں۔ اطہر جاوید ان کے معاون ہیں ——— ادبی صلاح کار اور مدیر بھی ہیں

اطہر جاوید لپک کر مجھ سے یوں بغل گیر ہو گئے جیسے برسوں کی جدائی کے بعد ملن کے لمحے نصیب ہوئے ہوں۔ حالاں کہ آمنے سامنے ہماری یہ پہلی ملاقات تھی۔ آج سے پہلے تک ہماری جان پہچان اور تعلقات کا ذریعہ ماہنامہ "تخلیق" تھا جو مجھے برابر موصول ہوتا تھا اور یا کبھی کبھار بھیجے گئے میرے

افسانے تھے جو جریدے کے صفحات کی زینت بنتے تھے۔ اس طرح ہماری برسوں پرانی جاموس دوستی کو آخر زبان مل گئی تھی۔

اطہر جاوید شاعر، صحافی، مدیر، تذکرہ نگار اور ہر جانے کیا کیا ہیں۔ ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر ہیں۔ ماہنامہ "ادبِ لطیف" کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیتے ہیں روزنامہ "امروز" میں میگزین انچارج ہیں۔ پنجابی اور اردو دو زبانوں میں شاعری اور نثر لکھتے ہیں یورپ ترصغیر میں انھوں نے سب سے پہلے ملبار کے افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا اور "ملباری افسانے" کے نام سے یہ کتاب شائع ہو کر بے حد مقبول ہوئی۔ چند پنجابی فلموں کی کہانیاں اور گیت بھی لکھ چکے ہیں بہت سی غیر ملکی زبانوں میں اُن کی شعری تخلیقات کے ترجمے ہو چکے ہیں عمر کے پچاسویں سال کے قریب پہنچنے کے باوجود جسم، دل اور دماغ سے بہت جوان ہیں کسی بھی محفل میں پہنچ جائیں تو خاموشیاں کوسوں دُور بھاگ جاتی ہیں اور اطہر جاوید کے قہقہے میلوں میلوں تک سُنائی دیتے ہیں۔ گھنٹہ بھر ان سے ملاقات رہی اور ہم ان کی ہنستی سوچ باتوں اور قہقہوں سے لُطف اندوز ہوتے رہے۔

صدیقہ بیگم سے بھی یہیں ملاقات ہوئی ماہنامہ "ادبِ لطیف" اُردو زبان و ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کی اپنی ایک شاندار ادبی تاریخ ہے اور اس سے اردو کے ہر بڑے ادیب اور شاعر کی کسی نہ کسی طرح وابستگی ضرور رہی ہے۔ فیض، ساحر لدھیانوی، ممتاز مفتی جیسے عظیم قلم کار اس رسالے کے مدیر رہ چکے ہیں۔ صدیقہ بیگم برصغیر کے مشہور ناشر اور ماہنامہ "ادبِ لطیف" کے بانی چودھری برکت علی مرحوم کی صاحبزادی ہیں۔ وہ لکھتی نہیں لیکن ادب و شعر پر گہری نظر ہے۔ ان کا سوشل حلقہ بہت وسیع ہے اپنے حلقے میں وہ بہت مقبول ہیں پاکستان کے مقبول ترین قلم کار اسحاق احمد اور بانو قدسیہ اُن کے سمدھی ہیں۔ صدیقہ کی بیٹی ان کے ہاں بیاہی ہوئی ہے۔ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ اور دانش ور حنیف رامے بھی صدیقہ کے سمدھی ہیں ان کا بیٹا رامے صاحب کی بیٹی سے بیاہا جا رہا ہے۔ ۱۹۸۱ء سے صدیقہ بیگم نے ماہنامہ "ادبِ لطیف" کی ذمہ داریاں سنبھال رکھی ہیں ۱۹۸۴ء میں شاعر فیض احمد فیض کی وفات کے بعد سب سے پہلے انھوں نے "ادبِ لطیف" کا ضخیم فیض نمبر شائع کیا تھا جسے ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں صدیقہ بیگم نے مجھے بتایا کہ "ادبِ لطیف" کی زندگی کی نصف صدی پوری

ہو جانے پر بہت جلد وہ اس کا گولڈن جبلی نمبر شائع کر رہی ہیں اور اس سلسلے میں زور و شور سے
تیاریاں شروع ہیں اُن کی شدید خواہش تھی کہ اس نمبر میں وہ پاک و ہند کے تمام بڑے ادیبوں اور
شاعروں کو شریک اشاعت کریں اس موضوع پر اُن سے بہت تفصیل اور گہرائی سے بات چیت ہوئی

ماہنامہ حرم کی مدیرہ طہیرہ مدنی

اطہر جاوید اور صدیقہ بیگم سے ملاقات کرنے کے بعد مقبول احمد دہلوی مجھے اپنے گھر لے گئے اتنے دنوں
سے میں لاہور میں تھا لیکن ابھی تک اپنی بھابی اور بچوں سے ملنے نہیں آسکا تھا لیکن آج کی آمد بھی بہت
مختصر اور رسمی رہی کیوں کہ گھر لوٹنے کی جلدی تھی اور وہاں سے تین بجے لاہور چھاؤنی میں مشہور افسانہ نگار
سائرہ ہاشمی کے ہاں پہنچنا تھا جنھوں نے میرے لیے ایک ادبی نشست کا اہتمام کر رکھا تھا مقبول دہلوی
کے گھر سے میں نے ماہنامہ "حرم" کی مدیرہ طہیرہ مدنی کو فون کیا طہیرہ مجھ سے سخت ناراض تھیں کہ اتنے دنوں
سے میں لاہور میں ہوں اور انھیں ملا نہیں میں نے وعدہ کیا کہ ملوں گا لیکن لاہور میں اپنے قیام کے آخری
روز تک میں ان سے ملاقات نہیں کر سکا۔ ظاہر ہے کہ اُن کی ناراضگی بڑھی ہوگی اور میں اس انتظار میں
ہوں کہ جب بھی موقع ملے میں اُن کی ناراضگی دُور کر سکوں۔ مجھے یاد ہے، طہیرہ مدنی چند سال قبل ایک
بار جب امرتسر تشریف لائی تھیں تو "حرم" کے بہت سے شمارے بطور تحفہ انھوں نے مجھے ارسال کیے تھے۔
اس سے قبل اور بعد میں بھی رسالہ وہ برابر بھیجتی رہی تھیں اور محبت و احترام کے ساتھ انھوں نے
میرا ذکر اپنے رسالے میں کیا تھا

سائرہ ہاشمی کے ہاں ادبی نشست

بعد دوپہر گھر پہنچے تو نسرین ہماری منتظر تھیں انھوں نے بتایا کہ یاد دہانی کے لیے سائرہ ہاشمی
دو بار فون کر چکی ہیں۔ تقریب کا وقت تین بجے تھا اور ہم بروقت وہاں پہنچ گئے۔ کچھ لوگ آ چکے تھے اور
باقی کی آمد کا سلسلہ جاری تھا گھنٹہ بھر ہم لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہوتے رہے، باتیں ہوتی رہیں
اور جب سائرہ ہاشمی کا وسیع و عریض خوبصورت ڈرائنگ روم آنے والوں سے بھر گیا تو تقریب شام افسانہ
کی صورت اختیار کر گئی اور اس شام افسانہ نے ایک نئی ادبی تنظیم کو جنم دیا جس کا نام "ہم انسان" رکھا گیا

سائرہ ہاشمی نے کہا افسانہ نگاروں کی اس نئی تنظیم کا قیام ڈاکٹر گیول دھیر کی لاہور آمد کی یاد دلاتا رہے گا۔ اس تقریب کی صدارت بیگم حجاب امتیاز علی نے کی اس میں مدرت الطاف، مستنصر حسین تارڑ، ڈاکٹر جمیلہ شوکت اور میں نے افسانے پڑھے۔ اس تقریب میں شرکت کرنے والوں میں نسرین رحمٰن، کشور ناہید، علامہ العزیز خالد، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر میمونہ انصاری، ڈاکٹر سلیم اختر، حسن رضوی، اطہر جاوید، مسعود اشعر، سعادت سعید، اشفاق نقوی، نشاط فاطمہ، راحت نقوی، مقبول دہلوی، بیگم انصار عبدالعلی، اکرم حسن، ممتاز شیخ، وحید عشرت، مدرت الطاف، عامر لودھی، وحیدہ لودھی اور درجنوں دوسرے اہل قلم حضرات شامل تھے جن سکے نام اب میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہیں افسانے صرف پڑھے اور سنے گئے، ان پر بحث نہیں کی گئی۔ یہ سلسلہ ختم ہوا تو آپس میں بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ذاتی طور پر میرے بارے میں میری کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں کے بارے میں سوالات پوچھے گئے۔ بھارت میں اُردو ہندی اور پنجابی ادب کے مختلف پہلوؤں پر باتیں ہوئیں۔ چند ناموں کو چھوڑ کر ان میں سے بیشتر وہ لوگ تھے جو ملکی تقسیم کے بعد بھارت سے یہاں آئے تھے لیکن بھارت کے ساتھ کسی نہ کسی طرح اُن کی جذباتی وابستگی تھی کئی ایسے لوگ بھی تھے جن کا جنم ملکی تقسیم کے بعد کے دنوں میں ہوا تھا اور بھارت کے بارے میں بہت کچھ جاننے کی اُن کی شدید خواہش تھی پوچھے گئے مختلف سوالوں کے جواب میں میں نے انھیں ہر ممکن جانکاری دینے کی کوشش کی میں نے شدت سے محسوس کیا کہ دونوں طرف محبت اور دوستی کا جذبہ موجود ہے اور دونوں طرف کے قلم کار، دانشور اور عوام دونوں دیشوں میں بہتر تعلقات اور دوستی کے خواہاں ہیں نسرین رحمٰن، وحیدہ لودھی، سائرہ ہاشمی، میمونہ انصاری، کشور ناہید، آغا سہیل وغیرہ کی تخلیقات بھارت کے مقبول ادبی جریدوں میں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں اور ان کے قلم کے توسط سے دونوں دیشوں کے قارئین کے درمیان ایک ایسا جذباتی رشتہ قائم ہو گیا ہے جو بے حد طاقتور اور اٹوٹ ہے لیکن دونوں دیشوں میں نے شمار ایسے قلم کار ہیں جو صرف اپنے دیش کے جریدوں ہی میں چھپتے ہیں اور قلم وراں کے رشتے سے وہ دوستی کے اس رشتے کو استوار کرنا چاہتے ہیں اسی لیے وہ چاہتے ہیں کہ دونوں دیشوں میں کتابوں اور رسالوں کا زیادہ سے زیادہ تبادلہ ہو اور دونوں دیشوں کے درمیان آنے جانے کی پابندیوں کو نرم کر کے آسان تر بنایا جائے۔

میرے اعزاز میں لاہور میں منعقد ہونے والی یہ پہلی بڑی ادبی تقریب تھی جس میں بہت بڑی تعداد میں

معروف افسانہ نگاروں، ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی تھی۔ ان تمام لوگوں سے بیک وقت ملنے اور تبادلۂ خیالات کا موقع فراہم کرکے سائرہ ہاشمی نے بہت محنت، محبت اور تکلف کا اظہار کیا تھا اس موقع پر سائرہ ہاشمی، ممونہ انصاری اور کئی دوسرے اہل علم حضرات نے بہت خلوص کے ساتھ مجھے اپنی کتابوں کے تحفے بھی پیش کیے۔ باہر بارش کی بوچھاروں کے بعد ہلکی ہلکی بوندا باندی سرار ہو رہی تھی اندر دوستوں کی محبت کی تپش ملی تھی جسے سائرہ ہاشمی کی شاندار مہمان نوازی اور گرم گرم حلیم اور خلوص نے اہل ذوق کی بھرپور تواضع کی تھی۔ میری زندگی کی یہ ایک یادگار شام تھی

سائرہ ہاشمی ایک خوب صورت فنی شخصیت

سائرہ ہاشمی کی شخصیت پرکشش ہے۔ اُن کی فنی شخصیت میں بھی بلا کی خوب صورتی ہے کیوں کہ سائرہ خود ایک حساس عورت ہے اس لیے ان کی کہانیاں عام طور پر عورت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے سائرہ ہاشمی کے پہلے افسانوی مجموعے "ریت کی دیوار" کے حرف آغاز میں بہت سچ لکھا ہے ـــــــــ " اس میں شبہ نہیں کہ عورت روشنی ہے، رنگ ہے، آواز ہے، خوشبو ہے اسی لیے تو شاعروں نے اسے دُنیا کی شاعری سے تعبیر کیا ہے اس کے بغیر زندگی بے نور ہے، وصال کیف ہے، ماحول ویران ہے اس کے وجود سے تصویر کائنات میں رنگ نظر آتا ہے۔ اور انسانی زندگی روشنی سے ہمکنار دکھائی دیتی ہے، لیکن انسانیت کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس کا وجود اس حقیقت کے باوجود انسانی زندگی کے ہر دور میں ایک مسئلہ رہا ہے وہ اگرچہ مکالمات افلاطون نہ لکھ سکی لیکن شرار افلاطون اسی کے شعلے سے ٹوٹتا پھر بھی اس کی ذات خود اپنے لیے، اپنے ماحول کے لیے، اپنے معاشرے اور تہذیب کے لیے ایک مسئلہ ہی نہیں بلکہ ایک پیچیدہ مسئلہ رہی فلسفیوں، مفکروں، سیاست دانوں اور تہذیب کے علمبرداروں نے اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن یہ مسئلہ جہاں تھا وہیں کا وہیں رہا اور آج بھی کہ انسانی زندگی ترقی کی بے شمار منزلیں طے کرکے آسمانوں پر کمندیں ڈال چکی ہے، لیکن اس کے باوجود عورت ہر معاشرے میں مجبور اور معذور ہے اور اس مجبوری اور معذوری کا عکس اس کی زندگی کے حسیاتی، معاشرتی اور تہذیبی پہلوؤں پر ہر جگہ نظر آتا ہے سائرہ ہاشمی نے اپنے افسانوں میں انہیں پہلوؤں کو مختلف زاویوں سے دیکھنے اور

دکھانے کی کوشش کی ہے۔" سائرہ ہاشمی کے کئی افسانے میں پہلے بھی پڑھ چکا تھا۔ مزید پڑھنے کا موقع ملا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ سائرہ بہت سی دوسری خواتین افسانہ نگاروں سے مختلف نظر آتی ہیں۔ وہ عورت کے کردار کے ساتھ خود جذباتی نہیں ہوتیں بلکہ ان انسانی رشتوں کے جذبات کو لکھاتی ہیں جو ہمیں درد، ٹیس اور آنسوؤں کی جذباتی کیفیت اور تلخ حقیقت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ سائرہ ہاشمی کے افسانوں میں باقاعدہ ایک پلاٹ ہوتا ہے اور اس کے کردار جیتے جاگتے انسانوں کی کہانی بیان کرتے ہیں ـــــ کچھ اس طرح کہ قاری کا میدارِ ذہن قلم کار کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ اُس کے اشاروں اور علامتوں کے بوجھ تلے دبتا نہیں اسی لیے سائرہ ایک کامیاب اور مقبول افسانہ نگار ہیں۔

افسانہ نگار وحیدہ لودھی

وحیدہ لودھی اور ڈاکٹر میمونہ انصاری تو بہت عرصے سے کہانیاں لکھ رہی ہیں اور اُردو ادب میں انھیں قابلِ احترام مقام حاصل ہے۔ وحیدہ لودھی کے لکھنے کے معیار اور رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اکثر ان کی کوئی نہ کوئی نئی تخلیق بھارت اور پاکستان کے ادبی جریدوں میں پڑھنے کو ملتی ہے اور ہر بار ایک نئے احساس کو جنم دے جاتی ہے۔ اس نشریے میں پڑھے گئے وحیدہ لودھی کے افسانے نے حد متاثر کیا۔

تب ساڑھے آٹھ بجے تقریب سے فارغ ہو کر سائرہ ہاشمی کے یہاں سے میں اور بشریٰ رحمٰن گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچے تو بشریٰ کے چھوٹے بھائی غزالی صاحب ہمارے منتظر تھے اُس سے تعارف کراتے ہوئے بشریٰ نے کہا ـــــ "غزالی سے ملو ـــــ یہ میرے اور آپ کے چھوٹے بھائی ہیں" ان چند الفاظ میں کتنا اپناپن تھا ـــــ کتنا پیار تھا ـــــ اخوت کا رشتہ محض ایک نام ہوتا ہے جذبات کے انسانی رشتوں میں ایک احساس ہوتا ہے اور یہی احساس تو ہمیں زندگی کے قریب لاتا ہے آپس میں محبت کرنا سکھاتا ہے۔ محبت کا یہی احساس مختلف انسانی رشتوں کے روپ میں مجھے ہر دن، ہر جگہ ملا تھا۔

کھانے سے پہلے کھانے کی میز پر اور کھانے کے بعد غزالی بھائی سے بہت دیر تک بہت سی باتیں

ہوئیں۔ عزالی سرکاری عہدے پر ایک اعلیٰ پوزیشن میں ہیں لیکن ان کی سادہ مزاج ،سادہ شخصیت اور سیدھی باتوں نے من موہ لیا۔ نسترین نے بتایا کہ عزالی خوب صورت باتیں ہی نہیں کرتے خوب صورت تقریر بھی کرتے ہیں لیکن ان کی تقریر سننے کا موقع نہیں نہیں ملا

جوش آمدید۔۔۔ ہند پاک پریم سبھا کی طرف سے

اگلے روز ۲۳؍ جنوری کو سویرے ہی ہند پاک پریم سبھا" کی بہار شاخ کی طرف سے مجھے ایک تار موصول ہوا جس میں پاکستان میں میری آمد پر خوش آمدید کہا گیا تھا اور میرے دورے کی کامیابی کے لیے دعا کی گئی تھی۔ کافی برس پہلے مشہور شاعر اور کالم نگار جناب رئیس امروہوی نے اس سبھا کی تشکیل کی تھی پاکستان میں جناب رئیس امروہی اور بھارت میں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی اس کے سربراہ ہیں۔ دونوں دیشوں کے کئی بڑے شہروں میں اس کی شاخیں بھی قائم ہیں اس کا مقصد دونوں دیشوں کے درمیان ادبی، علمی اور ثقافتی سطح پر بہتر اور خوش گوار تعلقات قائم کرنے میں تعاون دینا ہے جناب رئیس امروہی کراچی میں مقیم ہیں اور عملی طور پر ان کوششوں میں مصروف ہیں۔ آج ہی مجھے کراچی سے ان کا خط ملا کراچی سے ایک خط جناب راغب شکیب کا موصول ہوا، دونوں کی خواہش تھی کہ میں کراچی کا دورہ بھی کروں ڈاکٹر جمیل جالبی (وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی)، ماہنامہ ادبی ڈائجسٹ" کے مدیر جناب صبا الرحمٰن صبا اور شاعرہ عمیمہ جعفری بھی کراچی میں مقیم ہیں اور یہ تمام میرے دوستوں میں سے ہیں کراچی کا دورہ کر کے ان تمام دوستوں سے ملنے کی میری بھی آرزو تھی لیکن ابھی تک کوئی پروگرام طے نہیں ہو سکا تھا۔

ہم تاج سعید سے بات نہیں کر سکے

اردو کے مشہور ادیب جناب تاج سعید اور افسانہ نگار محترمہ زیتون بانو سے بھی میرے مراسم ہیں پشاور سے وہ ایک ادبی جریدہ شائع کرتے ہیں جس کا نام بھی " جریدہ" ہی ہے اس سے قبل ان کی ادارت میں " قند" رسالہ شائع ہوتا تھا اور ادبی حلقوں میں اسے ایک خاص مقام حاصل تھا۔ گذشتہ برس جریدہ رسالے کا انھوں نے نہایت خوب صورت راجندر سنگھ بیدی نمبر شائع کیا تھا

یہ ممتاز عظیم افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کی زندگی ہی میں شائع ہوگیا تھا اور اسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی تھی پشاور کا ویزا میرے پاس نہیں تھا اس لیے پشاور جانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے لاہور سے پشاور والیسیں فون کرنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن رابطہ قائم نہیں ہو سکا اُن کے دیش میں، ان کی دھرتی پر ہوتے ہوئے بھی اُن سے ملاقات نہ ہو پانے کی بے بسی تھی پر سنا تھا کہ پاکستان میں ٹیلیفون سروس بھارت کے معاملے میں بہتر ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی مشینری بے شک جدید ترین ہو لیکن ان مشینوں پر کام کرنے والے لوگ بھی تو ویسے ہی ہونے چاہئیں ـــــــ یعنی ماہر، محنتی اور فرض شناس۔ ایشیائی ممالک کے لوگوں میں عموماً یہ اوصاف ابھی نہ جانے کیوں پیدا نہیں ہو سکے ـــــ اور نہ جانے کب پیدا ہو سکیں گے۔

میناباز ار کی سیر

ادبی ماحول سے ہٹ کر آج ایک ماتجربہ پاکستان میں ہوا۔

ہر سال ماہ جنوری / فروری میں مختلف اسکولوں میں "مینا بازار" لگتے ہیں یہ ایک طرح کی تقریب ہوتی ہے جس میں کسی ایک شخصیت کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا جاتا ہے۔ مہمان خصوصی رسم افتتاح ادا کرتا ہے۔ اسکول کے بچے ایک بازار سجاتے ہیں اس بازار میں مختلف قسم کی چیزوں کے اسٹال لگائے جاتے ہیں یا اسٹال کھانے پینے کی اشیاء نیز بچوں کی دلچسپی کے دیگر اشیا کے ہوتے ہیں۔ بیشتر چیزیں بچے اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے ہیں اور پھر اسٹالوں پر ان کی فروخت کرتے ہیں۔ بچوں کی دلچسپی کے رنگا رنگ پروگرام بھی ہوتے ہیں جس میں بچے ہی شریک ہوتے ہیں۔

لاہور کے ایک مقامی ماڈل اسکول میں اسی طرح کے ایک میناباز ار کی تقریب منعقد کی گئی تھی جس کا افتتاح نسرین رحمٰن کو کرنا تھا وہ اس تقریب میں مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔ طاہرہ اور قدسیہ بھی ان کے ہم راہ تھیں۔ ہم سب کو سواگت کا ہار پہنایا گیا ـــــــــ اور پھر نسرین نے سُرخ ربن کاٹ کر تقریب کا افتتاح کیا۔ مینا بازار میں بچوں نے بہت سے اسٹال سجائے ہوئے تھے۔ لڑکیوں کی کشیدہ کاری، بچوں کی مصوری، مصنوعی پھول، کھلونے اور بہت سی دوسری ایسی چیزیں نمائش اور فروخت کے لیے پڑی تھیں جنہیں بچے بچے ہاتھوں نے تیار کیا تھا یہ سب مجھے بہت

اچھا لگا تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی دل چسپی ایسے مختلف کاموں میں ہو بی جانے سے سک یہ دل چسپی شوق ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔ اس سے بچوں میں عملی زندگی کی ذمہ داریوں کا احساس جنم لیتا ہے اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی لگن پیدا ہوتی ہے۔ یہ احساس اور لگن زندگی میں وتمواس اور قوت ارادی پیدا کرتے ہیں۔ ہم نے سجے ہوئے مینا بازار کے اسٹالوں کا چکر لگایا چھوٹی بچیوں نے رنگ برنگی چوڑیوں کا ایک اسٹال بھی لگایا ہوا تھا جہاں انھوں نے نسرین رحمٰن کی کلائیاں چوڑیوں سے بھر دیں اور چوڑیوں کا ایک پیکٹ میری بیٹی کے لیے بھی بطور تحفہ مجھے پیش کیا۔

آخر میں ہم سب مہمانوں کی تواضع چائے اور دیگر لوازمات سے کی گئی۔ اس موقع پر منتظمین سے پاکستان کے تعلیمی ڈھانچے اور تعلیم کے دیگر پہلوؤں پر بہت تفصیل سے بات چیت ہوئی مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ پاکستان میں لازمی تعلیم رائج نہیں ہے اور نہ ہی وہاں سرکاری اسکولوں میں بچوں کو مفت تعلیم کی سہولت میسر ہے۔ اس کے برعکس بھارت میں لگ بھگ تمام صوبوں میں لازمی تعلیم رائج ہے اور دسویں جماعت تک مفت تعلیم کی سرکاری سہولت میسر ہے دونوں۔ ریاستوں میں پرائیویٹ ماڈل اسکولوں یعنی پبلک اسکولوں کی بھرمار ایک سی ہے یہاں اور وہاں والدین اپنے بچوں کو ایسے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم دلوانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بھارت کی طرح ہی پاکستان میں بھی ایسے اسکولوں کی فیس بہت زیادہ ہے ـــــ یعنی تعلیمی اداروں کا کاروبار دونوں ریاستوں میں ایک جیسا ہی ہے۔

کتابوں کی جنت قائد اعظم لائبریری

الحمرا آرٹ سنٹر میں بھارتی ادیبوں کے اعزاز میں منعقدہ تقریب کے موقع پر قائد اعظم لائبریری لاہور کے ایک ذمہ دار افسر (جن کا نام مجھے یاد نہیں ہے) نے مجھے لائبریری میں آنے کی دعوت دی تھی آج کے پروگرام میں مینا بازار کی تقریب کے بعد نسرین رحمٰن کے ہمراہ قائد اعظم لائبریری جانا بھی شامل تھا بعد دوپہر جب ہم وہاں پہنچے تو جناب اسلم قریشی نے نہایت گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا جناب اسلم قریشی لائبریری انتظامیہ کے غیر سرکاری رکن ہیں اور اس ادارے کی دیکھ بھال ان کے ذمے ہے۔

عمارت جو پہلے جیمخانہ تھی

قائدِ اعظم لائبریری باغِ جناح لاہور میں ایک وسیع اور شاندار عمارت میں واقع ہے انگریز حکومت کے زمانے میں یہ شاندار عمارت جیمخانہ کلب تھی جہاں ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع تھا ملکی تقسیم اور قیامِ پاکستان کے بعد یہ کلب قائم رہی لیکن اس کی رکنیت سوسائٹی کے اونچے طبقے تک محدود رہی جس سے عام آدمی کے لیے اس کلب میں جانا اور اس عمارت کو دیکھنا ایک خواب جیسی بات ہی تھی وزیرِ اعظم بھٹو کی حکومت کے جانے کے بعد جب اقتدار مارشل لا نظام کے تحت صدرِ مملکت جناب ضیاء الحق نے سنبھالا تو انھوں نے پاکستان میں اسلامی طرز کی حکومت رائج کرنے کا فیصلہ کیا اور ملک میں بہت سی تبدیلیاں لائی گئیں۔ اسی تبدیلی کے تحت جیمخانہ کلب کو ختم کر کے مئی ۱۹۸۱ء میں اس شاندار عمارت میں قائدِ اعظم لائبریری کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسی برس ماہِ اکتوبر میں اس لائبریری کی رسمِ افتتاح صدر صاحب نے ادا کی۔ یہ عمارت ایک کلاسیکل آرکیٹکچر کا نمونہ ہے اس لیے اس کی بنیادی شان و شوکت اور خوبصورتی میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ برطانوی سامراج کے زمانے میں انیسویں صدی میں اس عمارت کی تعمیر کی گئی تھی جس کی شان و شوکت کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے لیکن ساتھ ہی اسے ایک ماڈل لائبریری کا روپ بھی دیا گیا ہے عمارت کا بیشتر حصہ ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ فرش سنگِ مرمر کا ہے اور اس کی چھت کے نیچے مصنوعی سیلنگ موجود ہے جس پر جگمگاتی دھیمی روشنیوں کے دلکش فانوس آویزاں ہیں اس میں چھوٹے اور بڑے تمیں کانفرنس ہال ہیں مکمل لائبریری کو بہترین فرنیچر اور کتابوں کی الماریوں اور شیلفوں سے آراستہ کیا گیا ہے

قائدِ اعظم لائبریری کی خصوصیت یہ ہے کہ بنیادی طور پر اسے دو شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک شعبہ ریسرچ اسکالرز کے لیے ہے اور دوسرا عام قارئین کے لیے۔ دونوں بڑے شعبوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے لائبریری میں بیک وقت دو سو سے زائد افراد بیٹھ کر مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ریسرچ اسکالرز کے مطالعہ کے لیے خاص انتظام کیا گیا ہے۔ کہیں چھوٹے کیبن ہیں اور کہیں ساؤنڈ اسکرین کے ذریعہ وسیع کمروں کو مختلف حصوں میں بانٹا گیا ہے تاکہ بغیر کسی خلل کے اور خوشگوار تنہائی میں بیٹھ کر ریسرچ اسکالر مطالعہ کر سکیں اور نوٹ وغیرہ لے سکیں لائبریری میں اسلام، پاکستان اور اورینٹل لٹریچر کے

الگ الگ موضوعاتی شعبے ہیں۔ اسی طرح مختلف موضوعات سائنس، فلسفہ، ٹیکنالوجی، ادب وغیرہ کے بھی الگ شعبے ہیں کتابوں کے علاوہ لائبریری میں ریکارڈز (Records) مائکروفلم ریڈرز (Micro film readers) ویڈیو میٹریل (Video material) اور آڈیو ویژول ایڈز (Audio visual aids) بھی ہیں کیمرہ اور فوٹو کاپی مشینیں بھی یہاں نصب ہیں بہت سا تاریخی و ادبی ذخیرہ ان جدید ترین مشینوں اور طریقے سے محفوظ کیا گیا ہے بہت سے قدیم اور خستہ نسخوں کو مائیکرو فلم کی مدد سے محفوظ کر لیا گیا ہے

چالیس ہزار کتابوں کا ذخیرہ

قائداعظم لائبریری میں اس وقت انگریزی اور دیگر مختلف زبانوں کی چالیس ہزار سے زائد کتابیں موجود ہیں اور یہ کتابیں ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۴ء تک کی قلیل مدت میں جمع کی گئی ہیں اور ہر ماہ پانچ سو کتابوں کا اضافہ باقاعدگی سے کیا جاتا ہے فی الحال لائبریری میں ایک لاکھ کتابیں رکھنے کی گنجائش ہے اس وقت لائبریری میں مختلف ممالک سے، مختلف موضوعات پر تین سو سے زائد رسالے اور جریدے باقاعدگی سے منگوائے جاتے ہیں۔ ایسے منتشر رسالے اور جریدے امریکہ اور برطانیہ سے منگوائے جاتے ہیں جن کی مجموعی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے، چین، کناڈا، جرمن، ہانگ کانگ، بھارتی جاپانی، روسی، سعودی عرب وغیرہ بہت سے ملکوں سے رسالے وغیرہ بھی یہاں آتے ہیں غیر ممالک سے جو روزنامہ اخبار یہاں منگوائے جاتے ہیں ان میں بھارت میں شائع ہونے والے اخبارات — "ہندوستان ٹائمز" — "ہندو" — "ٹائمز آف انڈیا" — اور "انڈین ایکسپریس" شامل ہیں

قائداعظم لائبریری میں خواتین اور بچوں کے لیے علیحدہ سیکشن ہیں عورتوں کے سکشن میں اسلامیات کے علاوہ صحت عامہ، تعلیم، گھریلو معاشیات، کوکری وغیرہ موضوعات پر لٹریچر خاص طور سے رکھا گیا ہے۔ اسی طرح بچوں کے سکشن میں بچوں کی دلچسپی کی خوبصورت باتصویر کتابیں موجود ہیں ان کے علاوہ کیسیٹ اور فلمیں بھی ہیں جن میں بچے بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ اس سیکشن کی رنگ برنگی سجاوٹ اور بچوں کے لیے خاص طور سے تیار کرایا گیا آرام دہ فرنیچر جدید ترکشش ہیں اس کی دیکھ بھال خواتین کے سپرد ہے۔

جب ہم قائدِاعظم لائبریری میں پہنچے تو اسلم قریشی صاحب نے استقبال کیا سب سے پہلے ہمیں پروجیکٹر پر ایک فلم دکھائی گئی جس سے لائبریری کے بارے میں ہر طرح کی جانکاری ہمیں مل گئی بعد ازاں وہ ہمیں مختلف شعبوں میں لے گئے اور ہر شعبے سے متعلقہ کتابوں اور دیگر امور کی جانکاری بہت تفصیل سے ہمیں دیتے رہے ملاقات۔ ایک شاندار لائبریری ہے اور یہاں کتابوں کا بھرپور ذخیرہ ہے قریشی صاحب کے دفتر میں ہمیں پُرتکلف چائے کا اہتمام کیا جب ہم روانہ ہونے لگے تو انہوں نے وزٹرز بک ——— (visitors book) میرے سامنے رکھ دی تاکہ میں اپنے تاثرات لکھ دوں ——— اور میں نے لکھا ——— 'کتابوں کی اس جنت میں رہ جانے کو جی چاہتا ہے'۔

یہیں پر ہماری ملاقات مشہور صحافی، ادیب اور فلم ساز جناب خواجہ احمد عباس کے چچا زاد بھائی خواجہ تصور علی حیدر صاحب سے بھی ہوئی اور ان کی دلچسپ باتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا جناب اسلم قریشی اور خواجہ صاحب کے ساتھ ہم نے یہاں ایک تصویر بھی کھنچوائی

بعد دوپہر ہوٹل پرل کانٹی نینٹل میں ایک ادبی تقریب میں شمولیت کا دعوت نامہ مجھے ملا تھا یہ تقریب کسی کتاب کی ریلیز کے سلسلے میں تھی لیکن ہوٹل پہنچے پر پتہ چلا کہ کسی وجہ سے تقریب منسوخ ہوگئی ہے وہاں سے سری رجنی کے ہمراہ میں گھر آگیا۔

ایک اور ادبی تقریب

آج ہی لاہور کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک اور ادبی تقریب منعقد کی گئی تھی جو شعر کے ممتاز مزاح نگار سید محمد جعفری مرحوم کے شعری مجموعے 'شوخیِ تحریر' کی رسم رونمائی کے سلسلے میں تھی مشہور اردو اور پنجابی شاعر جناب حسن رضوی نے مجھے اس تقریب میں شرکت کرنے کی دعوت دی تھی بتایا گیا تھا کہ اس تقریب میں برصغیر کے معروف ادیب و ڈرامہ نگار جناب اشفاق احمد اور منو بھائی کو بھی مضمون پڑھنا ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے دوسرے قلم کار حضرات کی آمد بھی متوقع ہے ان تمام اہلِ قلم حضرات سے ایک ہی جگہ ملاقات ہو جائے گی، یہ سوچ کر میں نے دعوت قبول کر لی تھی لیکن اشفاق احمد اور منو بھائی تقریب میں تشریف نہیں لا سکے اور ان سے ملاقات کی خواہش پوری نہیں ہو سکی لیکن بعض دوسرے ادیب دوستوں سے ملاقات ضرور ہوگئی اس شاندار تقریب کی صدارت مشہور شاعر مرحوم فیض احمد فیض کی اہلیہ محترمہ

بیگم الماس ویمیں نے کی اور نظامت محترمہ کشور ناہید نے کی کشور ناہید کی نظامت کا انداز بھی ان کی شخصیت
اور فن کی طرح منفرد ہے جناب سجاد باقر رضوی اور جناب احمد ندیم قاسمی نے اپنے مضمون پڑھے انہیں
شاہت سے دوستوں سے ملاقات ہوئی اور شام ڈھلے گھر لوٹ آیا۔ آج کی شام نسرین اور بچوں کے
ہمراہ گھر سے باہر گذاری اور چینی ہوٹل "ست گھائی" میں رات کا کھانا کھایا۔

لاہور کی سیاحت

۲۴ جنوری جمعہ یعنی شکروار کا دن تھا پاکستان میں جب سے اسلامی طرز حکومت رائج ہوا ہے
تب سے صدر ضیاء صاحب نے اتوار کی بجائے جمعہ کے روز چھٹی کرنے کا سلسلہ جاری کیا ہے تعلیمی ادارے،
بینک، دفاتر، بازار وغیرہ پاکستان میں اتوار کے روز کھلے رہتے ہیں اور جمعہ کو چھٹی منائی جاتی ہے نسرین
نے تاکید کی تھی کہ آج کے روز میں ایسا کوئی پروگرام نہ بناؤں کیونکہ چھٹی ہونے کے باعث میرے اور بچوں کے
ساتھ ان کا لاہور گھومنے کا پروگرام تھا صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ مکمل تفریح کے موڈ
میں اور پک نک منانے کے تمام ساز و سامان اور لوازمات کے ساتھ گھر سے نکل پڑے ہمارا پہلا
اور بڑا پڑاؤ زُو (zoo) تھا جسے عام طور پر ہم چڑیا گھر کہتے ہیں۔ یہ جگہ لاہور سے بیس کلومیٹر باہر بھارتی
سرحد کی طرف ہے اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری محکمہ جنگلات نے سنبھال رکھی ہے یہ جگہ تاحد میلوں کے
رقبے میں پھیلی ہوئی ہے، جہاں دُنیا بھر کے ہر طرح کے جانور موجود ہیں مختلف نسلوں اور قسموں کے کئی
جانور تو زندگی میں پہلی بار میں نے یہاں دیکھے۔ یہاں ایک مصنوعی جھیل، خوب صورت پارک اور میلوں
میں پھیلی اس جگہ کے مختلف حصوں تک جانے کے لیے پکی سڑکیں بنی ہوئی ہیں جمعہ کی تعطیل کے باعث آج
یہاں کافی رش تھا پیدل گھوم پھر کر اس جگہ کو دیکھا جاتا تو تاحد گھنٹوں لگ جاتے اس لیے ہم گاڑی میں
اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ قدرت نے خوب صورتی صرف انسانوں کو ہی نہیں بلکہ اُس نے بے زباں جانوروں کو
بھی عطا کی ہے اور اس خوب صورتی کو بنائے رکھنے کے لیے منتظمین نے ان کی ہر طرح سے بہتر دیکھ بھال،
پرورش اور آزادی کا ماحول بنائے رکھنے کے خاص انتظامات کیے ہوئے ہیں دوپہر ہو گئی تو ہم نے ایک
پارک میں ڈیرا ڈال لیا اور کھانے پینے کے بعد لوازمات کا مزا لیتے رہے۔

ہمارا دوسرا پڑاؤ شالامار باغ تھا مغلیہ دور کی نشانی یہ ایک تاریخی جگہ ہے جو لاہور شہر کی

گھنی آبادیوں کے عین قریب واقع ہے اس میں جابجا پیڑ، پھول، درختوں اور جھریوں کی بھرمار ہے، اور یہ سب اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں بشریٰ نے مجھے بتایا کہ جب بھی کسی ملک کا کوئی سربراہ یا کوئی دوسری بڑی شخصیت پاکستان میں تشریف آور ہوتی ہے تو ان کے اعزاز میں سب سے بڑی سرکاری تقریب لاہور کے اسی شالیمار باغ میں منعقد کی جاتی ہے۔ گذشتہ ماہ دسمبر میں صدر پاکستان جناب ضیاء الحق نے ہی دہلی میں جب بھارت کے وزیراعظم جناب راجیو گاندھی کو پاکستان آنے کی دعوت دی تھی تو انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی تھی۔ بشریٰ نے امید ظاہر کی تھی کہ راجیو صاحب عنقریب لاہور تشریف لائیں گے تو روایات کے مطابق اسی شالیمار باغ میں ایک شاندار سرکاری تقریب ہوگی بہت بڑا جلسہ ہوگا اور شالیمار باغ کو ایک نیا حسن نصیب ہوگا تب شاید بہار کا موسم ہوگا ہر طرف رنگ برنگے پھول کھلے لہرا رہے ہوں گے مصنوعی روشنیوں کی جگمگاہٹ کی چادر بکھری ہوگی اور اس باغ کو یہ نئی نویلی دلہن کی طرح سجا سنورا ہوگا۔

سہ پہر کا وقت ہو رہا تھا۔ بشریٰ ہمارا اکرام کرنے لگیں اور ہم ان لمحوں میں قدرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہے ہم اس سے فارغ ہوکر بشریٰ پھر ہمارے ساتھ ہولیں۔ شالیمار باغ سے ہم لوگ ریس کورس پارک کے لیے روانہ ہوگئے کسی زمانے میں یہ ریس کورس کا میدان تھا اور یہاں گھوڑوں کی دوڑ ہوا کرتی تھی اسلامی حکومت کے قیام کے بعد اس پر پابندی عائد کر دی گئی اور اس بہت بڑے اور کھلے میدان کو بچوں کے پارک میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہاں بڑے بڑے لان ہیں بچوں کی دلچسپی کے کھیل ہیں اور فائبر (F.b.r.e) کا ایک دلکش آبشار ہے چھٹی کی وجہ سے یہاں بھی خوب چہل پہل تھی بچے، جوان اور بوڑھے گھروں سے نکل کر کھلی فضاؤں میں چلے آئے تھے۔ اُن کھلی فضاؤں کی دلکشی نے ہمیں بھی جیسے باندھ لیا تھا۔

شام کے سائے ڈھلنے لگے تو ہم نے گھر کی طرف رُخ کیا صبح سے شام تک گھومتے پھرتے تھک گئے تھے لیکن مجھے ابھی ایک ادبی نشست میں حاضر ہونا تھا۔ پاک ٹی ہاؤس لاہور میں حلقۂ اربابِ ذوق کی طرف سے میرے اعزاز میں ایک اجلاس منعقد کیا گیا تھا۔ گھر پہنچ کر منہ ہاتھ دھویا کپڑے تبدیل کیے اور میں شام چھ بجے اجلاس میں شرکت کے لیے روانہ ہوگیا

حلقۂ اربابِ ذوق کی نشست

لاہور اور پاکستان کے بڑے شہروں میں ایسے ادبی حلقے قائم ہیں جن کی ہر ماہ باقاعدہ نشستیں ہوتی ہیں۔ ادیب اور شاعر اپنی اپنی تخلیقات ان میں پیش کرتے ہیں اور پھر ان تخلیقات پر کھل کر بحث ہوتی ہے۔ ادب کی ترقی، ارتقا اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے یہ حلقے سچ مچ اچھا کام کرتے ہیں۔ اس طرح لکھنے والوں کو ادبی ماحول میسر ہوتا ہے۔ لکھنے کی تحریک حاصل ہوتی ہے۔ لاہور کے ادبی حلقے تو ملک کی تقسیم سے پہلے کے وقتوں میں بھی بے حد مقبول تھے۔ راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، ساحر اور منٹو کی زبانی کبھی ہم ان حلقوں کے بارے میں سنا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بہت بڑے بڑے ادیب ان حلقوں میں شامل ہو کر اپنی تخلیقات پڑھا کرتے تھے۔ ان پر بھرپور بحث اور تنقید بھی ہوتی تھی۔ اس زمانے کے بے شمار قلم کاروں نے اپنی تخلیقات ایسی نشستوں میں پڑھیں اور بعد میں یہی تخلیقات شاہکار ثابت ہوئیں۔ مشہور ادیب جناب اوپندر ناتھ اشک نے تو اپنے ایک مضمون میں لاہور کی ان ادبی نشستوں کا بطور خاص ذکر بھی کیا ہے۔

ٹھیک ساڑھے چھ بجے جب میں پاک ٹی ہاؤس پہنچا تو صدر دروازے پر حلقۂ اربابِ ذوق کے جنرل سکریٹری اور مشہور افسانہ نگار پروفیسر سعادت سعید میرے استقبال کے لیے حاضر تھے۔ روزنامہ "جنگ" کے ادبی صفحات کے انچارج جناب حسن رضوی اور روزنامہ "مشرق" کے سب ایڈیٹر جناب سرفراز احمد بھی وہاں موجود تھے۔ پاک ٹی ہاؤس کی بالائی منزل کا ہال شاعروں اور ادیبوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں زیادہ تعداد نئے لکھنے والوں کی تھی۔ کل رات ہی جناب قتیل شفائی نے فون پر مجھے اطلاع دی تھی کہ وہ بھی اس اجلاس میں شرکت کریں گے لیکن یہاں پہنچنے پر پیغام ملا کہ کسی خاص وجہ سے وہ حاضر نہیں ہو سکیں گے۔ اچانک ہی انھیں اسلام آباد جانا پڑا تھا۔

اجلاس کی صدارت جناب جیلانی کامران نے کی۔ میں بطور مہمان خصوصی ان لوگوں کے درمیان تھا۔ حاضرین کی خواہش تھی کہ آج کے اجلاس میں میں اپنا ایک افسانہ پڑھ کر سناؤں اور باقی وقت صرف مجھ سے بات چیت کی جائے لیکن میں نے اصرار کیا کہ آپ اپنی کارروائی معمول کے مطابق چلائیں تاکہ میں بھی دیکھ سکوں کہ آخر آپ لوگ کرتے کیا ہیں؟ آخر میں میں نے افسانہ سنانے اور حاضرین سے بات چیت کرنے کا وعدہ

تھی کہ اس طرح پہلے حلقۂ ارباب ذوق کی کارروائی معمول کے مطابق چلی جس میں ایک افسانہ پڑھا گیا، چند نظمیں اور غزلیں پیش کی گئیں اور ان کے مختلف پہلوؤں پر کھل کر بحث ہوئی جناب ویدر ناتھ اشک نے لاہور کے اس زمانے کی ایسی ہی ہستیوں کا ذکر کیا ہے آج ویسی ہی ایک جاندار اور بھرپور ادبی محفل میں میں شریک تھا بعد میں میں نے اپنے تاثرات بیان کیے۔ ایک افسانہ بھی پڑھا حاضرین کے ذہنوں میں بھارت کے بارے میں، بھارت میں اُردو ادب کے بارے میں اور میرے بارے میں بے شمار سوالات تھے جو انھوں نے پوچھے اور میں نے جواب دیے آج کی اس بھرپور محفل میں جیلانی کامران، سعادت سعید، حسن رضوی، احمد سرور کے علاوہ عبادت الٰہی ملک، خان فضل الرحمٰن، سمیع آہوجہ، ناصر اکبر آبادی، افضل باقی، عینی حلوی، اکرم شیخ، سیف رضی، رشید مصباح، عبدالرشید، اختر کاظمی اور بہت سے دوسرے اُدبا و شعرا حضرات شریک تھے ——— اور جب اجلاس ختم ہوا تو رات کے دس بج رہے تھے۔

اُردو اور پنجابی کے شاعر حسن رضوی

ابھی گاڑی میں نے شام ہی کو واپس بھیج دی تھی۔ پاک ٹی ہاؤس سے گھر تک کی واپسی کا سفر میں نے حسن رضوی کی گاڑی میں انھیں کے ہمراہ کیا۔ شاید میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ حسن رضوی پیشے سے پروفیسر ہیں۔ پاکستان کے سب سے بڑے اخبار "جنگ" کے ادبی سیکشن کے انچارج ہیں اور بیک وقت اُردو اور پنجابی میں لکھتے ہیں۔ اُن کا شمار موجودہ دور کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ اُن کے کئی شعری مجموعے منظرِ عام پر آکر مقبول ہو چکے ہیں۔ بھارت کے علاوہ بعض دوسرے ممالک کا سفر وہ کر چکے ہیں۔ ان کا تعلق متحدہ پنجاب کے وقتوں میں انبالہ سے ہے اور اسی دھرتی سے جذباتی عشق ان کی دھڑکنوں اور سانسوں میں بسا ہے۔ راستے ہر وہ مجھ سے باتیں کرتے رہے اور میں ان کی سنجیدگی کے بے حد پیاری شخصیت سے متاثر ہوتا رہا۔

پاکستان ڈاکٹرز وزیر آغا کی

ادبی نقطۂ نگاہ سے آج یعنی ۲۵ جنوری کا دن میرے لیے ایک اہم اور یادگاری دن تھا ———

ڈاکٹر وزیر آغا اُردو ادب کا ایک ایسا نام ہے جس کے ذکر کے بغیر اُردو ادب کی بات پوری نہیں ہو سکتی۔ پاکستان روانہ ہونے سے قبل میں نے سرگودھا کا پروگرام اس لیے حاصل کیا تھا کہ ڈاکٹر وزیر آغا سرگودھا میں رہتے ہیں اور صرف ان سے ملاقات کے لیے مجھے سرگودھا جانا ہے۔ دو روز قبل ڈاکٹر انور سدید نے مجھے اطلاع دی تھی کہ میں سرگودھا جانے کا پروگرام رد کر دوں کیونکہ سب سے ڈاکٹر وزیر آغا کا پیغام ہے کہ مجھ سے ملنے ۲۵ر جنوری کو وہ خود ہی لاہور تشریف لا رہے ہیں ـــــ اور آج سویرے ہی ڈاکٹر وزیر آغا کا فون آیا کہ وہ لاہور آ چکے ہیں ـــــ اور میں ان کی کوٹھی واقع لاہور چھاؤنی چلا آؤں۔ اُس وقت صبح کے نو بجے تھے اور ساڑھے نو بجے کے قریب میری گاڑی ڈاکٹر وزیر آغا کے بنگلے کے سامنے کھڑی تھی۔ چند ہی لمحوں کے بعد ڈاکٹر صاحب صدر دروازے پر بہ نفسِ نفیس موجود تھے۔ تھوڑی دیر ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنی باہوں کے گھیرے میں باندھے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ میں اس گھڑی کے دھڑکتے لمحوں کے سنگت میں ڈوبے پیار کے پروں پر پرواز کر رہے تھے ـــــ اور پیار کی پرواز کے یہ لمحے میری زندگی کا بیش قیمتی سرمایہ تھے۔

ڈاکٹر وزیر آغا سے میرا غائبانہ تعارف بہت برس پہلے پہلی بار جب ہوا تھا جب میں اُردو کے مشہور شاعر اور مزاح نگار راجہ مہدی علی خان (مرحوم) سے دوسری بار بمبئی میں ملا تھا۔ غالباً یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے جب ڈاکٹر وزیر آغا اپنی بیگم اور بچوں کے ہمراہ بھارت تشریف لائے تھے اور بمبئی میں راجہ مہدی علی خان کے مہمان تھے۔ جب میں بمبئی پہنچا تو راجہ صاحب نے بتایا کہ ہفتہ بھر قبل ہی ڈاکٹر صاحب رخصت ہوئے ہیں۔ اُن کی آمد کے بارے میں مجھے علم ہوتا تو یقیناً میں ہفتہ دس روز قبل ہی بمبئی آ گیا ہوتا لیکن اب محض ان کے قیام کی کہانیاں بس خود راجہ مہدی علی خان مجھے سناتے رہتے اور اس طرح ڈاکٹر وزیر آغا سے میرا غائبانہ تعارف ہوا تھا۔ بعد میں ان سے گاہے گاہے خط و کتابت بھی ہوتی رہی اور وہ رسالہ "اوراق" بھی برابر بھجواتے رہے۔ اسی دوران بھارت اور پاکستان کے درمیان تعلقات زیادہ کشیدہ ہو گئے۔ جنگ ہوئی اور ڈاک کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ خط و کتابت بند ہو گئی۔ "اوراق" ملنا بھی بند ہو گیا۔ "فنون" ـــــ "دائرہ" ـــــ "سیپ" وغیرہ کئی دوسرے رسالے جو میرے نام آتے تھے وہ بھی ملنے بند ہو گئے اور اس طرح بہت سال گذر گئے۔ ۱۹۸ میں دہلی میں عالمی اُردو سیمینار ہوا اور پتہ چلا کہ اس سیمینار میں شرکت کے لیے جو پاکستانی ادیبوں کا وفد بھارت آ رہا ہے اس کی قیادت

ڈاکٹر وزیر آغا کرتے ہیں۔ زبردست خواہش کے باوجود علالت کے باعث میں دہلی تک کا سفر نہ کرسکا اور ڈاکٹر وزیر آغا سے ملنے کی خواہش بس ملتی ہی رہ گئی۔

یہ خواہش آج پوری ہوئی تھی اور بیلگوں روسی مس بیلے رم قالین سے سورے ڈاکٹر وزیر آغا کے ڈرائینگ روم میں صرف میں تھا اور ڈاکٹر صاحب تھے اجنبیت کا ذرا بھی احساس نہیں تھا ہمارے درمیان آپس داری کی باتیں ہوئیں بھارت اور پاکستان کی باتیں ہوئیں۔ ادب اور ادیبوں کا ذکر ہوا۔ پاکستان کی ادبی آنچ ہوا کا تیر چارہوا کرشن ادیب اور آزاد گلاٹی کی محبتوں کا ذکر چلا۔ بلراج کومل، جوگندر پال، کشمیری لال ذاکر، رام لعل اور کئی دوسرے بھارتی ادیبوں کے تخلیقی سفر پر تبادلۂ خیالات ہوا ____ یعنی ہر وہ موضوع ہماری بات چیت کا عنوان ما جو دو دوستوں اور دو ادیبوں کے درمیان ممکن ہوسکتا تھا۔ اور اس دوران بار بار میرے ذہن میں دھیمی آواز، لیست قد اور دبلے جسم کا یہ بڑا انسان مختلف روپ لے کر اُبھرا ____ ایک عظیم شاعر، ایک نقاد ____ اور ایک انشائیہ نگار ____ اس سب سے الگ ایک ایسا انسان جس سے اپنے آپ ہی عقیدت ہوجاتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اُن قلم کاروں میں سے ہیں جو اپنے عہد کی شناخت بن جاتے ہیں جناب مشفق خواجہ نے بہت صحیح فرمایا ہے کہ لکھنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے عہد سے پہچانے جاتے ہیں اور دوسرے وہ جن کے حوالے سے اُن کے عہد کو پہچانا جاتا ہے پہلے طبقے میں شامل ادیب کسی عہد کے ادب کی مجموعی قدر و قیمت کے تعین میں مدد دیتے ہیں اور دوسرے طبقے میں شامل ادیب اپنی زبردست تخلیقی توانائی اور فکری انفرادیت کی وجہ سے اپنے عہد اور آنے والے عہد کے درمیان رابطے کی علامت بن جاتے ہیں اور ادبی روایات انھیں کے ذریعہ ایک عہد سے دوسرے عہد کو منتقل ہوتی ہیں اور یوں انھیں کے حوالے سے اُن کے عہد کو پہچانا جاتا ہے اسی لحاظ سے ڈاکٹر وزیر آغا اپنے عہد کی پہچان بن گئے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے اندر ایک سچا اور کھرا انسان بستا ہے ____ ایک ایسا انسان جسے انسانیت سے محبت ہے اور جسے جنگ سے شدید نفرت ہے ____ جس کے دل میں پیار کا ساگر سمایا ہوا ہے اور جس کے حرفوں میں زندگی کی ہلچل ہے انھوں نے اپنی ایک طویل نظم میں جنگ کی ہولناکیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ____

مجھے ایک بھی سرِ تیا دکھائی نہیں دے رہا
ایک بھی بانسری کی مدھر تان
پانی کی گاگر کے پیچھے چھلکتی ہوئی وحشی ہرنی سی آنکھیں
کوئی ایک چمکیلا آنسو بھی باقی نہیں ہے!
دھواں، راکھ اور خوں
دھرتی کی اُدھڑی ہوئی کوکھ میں چند جھلسی ہوئی ہڈیاں
اُدھ جلے پریم تیروں کے ڈھانچے
درختوں کی لاشیں
مکانوں کی اُڑتی ہوئی دھجیاں
سُونے رستوں پہ بکھری ہوئی کھوکھلی سی ہوا کے سوا
اور کچھ بھی مجھے یاں دکھائی نہیں دے رہا!

افسانہ نگار سلیم آغا قزلباش

یہی گھر اپنا تھا اور پیار کرنے والا انسان میرے روبرو تھا اور کب باہر برسات ہوئی، کب صبح کے لمحے سرکتے ہوئے دوپہر کے دامن میں آ بسے مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ اس دوران کمرے میں نوجوان افسانہ نگار سلیم آغا قزلباش آتے جاتے رہے ہماری طویل باتوں میں شریک بھی ہوتے رہے سلیم ڈاکٹر وزیر آغا کے بیٹے ہیں اور بطور انشائیہ نگار انھوں نے اپنا ایک خاص نام اور مقام پیدا کیا ہے سلیم کا پہلا افسانوی مجموعہ ابھی ابھی شائع ہوا ہے۔ انگور کی بیل، اس کتاب کے سرورق پر جناب اشفاق احمد نے لکھا ہے ـــــ "... سلیم آغا پورے کا پورا اس عہد کا افسانہ نگار ہے اور اس کی سوچ میں وہ تمام تقاضے اپنی ساری وضاحتوں کے ساتھ موجود ہیں جو عہدِ حاضر کی پیداوار ہیں ـــــ"
سلیم کی ذات میں تمام جدتیں، حساسیت اور اعتماد ہے جو ایک بہتر افسانہ نگار میں ہونا چاہیے۔

مشہور نقاد اور شاعر شہزاد احمد

دوپہر ہوتے ہوتے مشہور شاعر اور نقاد جناب شہزاد احمد تشریف لے آئے اور باتوں کا سلسلہ برابر جاری رہا شہزاد احمد کے دو اشعار آپ کی نذر ہیں ـــــ

میں آنکھ سے ٹپکے ہوئے اِک اشک کی مانند
بے مایہ بھی ہوں اور مری قیمت بھی بہت ہے

گہرے ہیں سمندر سے بھی آنکھوں کے اندھیرے
انساں ہمیشہ انہی غاروں میں رہے گا

جناب انور سدید سے مُلاقات

ڈاکٹر وزیر آغا جناب انور سدید کو دو بار فون کر چکے تھے اور دوپہر کے کھانے پر اُن کی آمد کا انتظار تھا جب انور سدید تشریف لے آئے تو ہم لوگ کھانے کی میز پر چلے آئے۔ دوپہر کے کھانے اور پھر چائے سے فارغ ہو کر شہزاد احمد چلے گئے۔ اب بات چیت میں ہمارے ساتھ انور سدید شریک ہو گئے تھے۔

انور سدید پیشے سے انجینئر ہیں اور محکمۂ آب پاشی میں ایگزیکٹو انجینئر کے سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔ "اُردو ادب کی تحریکیں" موضوع پر انھوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے بیشتر کتابیں تنقید کے موضوع پر ہیں۔ انھوں نے جہاں کہانی لکھی، شاعری کی، تنقید لکھی، طنز و مزاح میں 'غالب کے خطوط' جیسی کتاب پیش کی وہاں بہترین انشائیے بھی لکھے ہیں انور سدید ایک بے باک اور ذہین علم کار ہیں موجودہ عہد کے اُردو ادب میں انھوں نے حق گوئی و بے باکی کی روایت کو نہ صرف زندہ رکھا ہے بلکہ بے باک بنایا ہے اور جیسے ان کا قلم کہہ رہا ہو ـــــ

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں (حفیظ جالندھری)

انور سدید کی باتوں میں بھی ایسی ہی بے باکی، صاف گوئی اور گہرے مطالعے کی جھلک واضح طور پر ملتی رہی۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے انور سدید کی دوستی بہت گہری اور بے لوث ہے۔ ان کی عالمانہ اور سنجیدہ باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ایک بار کسی نے کہا تھا کہ انور سدید "ادبی دیو" ہے اور شاید یہ بہت صحیح کہا گیا تھا، کیونکہ میرے خیال میں انور سدید ایک فرد کا نام نہیں کئی افراد کا مجموعہ ہے جو ادب کے مختلف شعبوں میں نہایت خوش اسلوبی اور نہایت ایمان داری سے سرگرم عمل ہے۔

شام کے سائے ڈھل کر اندھیروں میں سمانے لگے تھے اور پھر ان اندھیروں کو بجلی کے اجالوں نے روشنیوں میں بدل دیا تھا لیکن ہماری گفتگو کا سلسلہ برابر جاری رہا تھا۔ اس دوران بہت باروں کی گھنٹی بجی تھی۔ دوسری طرف ڈاکٹر وزیر آغا سے مخاطب ہونے والے ان کے ادیب اور شاعر دوست تھے جو ان سے ملنے کے خواہاں تھے لیکن ڈاکٹر صاحب نے آج نہ مل سکنے کے لیے معذرت طلب کی تھی۔ یہ میرے لیے فخر کی بات تھی کہ آج کے دن کا ایک ایک لمحہ انھوں نے میرے لیے وقف کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں انور سدید بھی ہمارے ساتھ تھے۔ محبتوں کے ملن کے یہ لمحے تیسرے پہر تک صدیوں میں دھڑکنیں بن کر سماتے رہے اور پھر ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید اپنی گاڑی میں مجھے نستری رہن کے بنگلے تک چھوڑنے کے لیے میرے ساتھ ہو لیے۔ جب ہم وداع ہونے لگے تو ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑی محبت سے مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا ——— "بھارت میں ظ۔ انصاری کے بعد آپ دوسرے آدمی ہیں جس سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔" ان الفاظ میں پیار کا ایک ساگر تھا ——— اپنائیت کی بے پناہ گرمی تھی ——— اور اس عظیم انسان کی عظمتوں کی بھرپور جھلک تھی۔ اپنے من کے ردِّ عمل اور جذبات کے اظہار کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں تھے۔ میں ادب کا ایک طالب علم ہوں، ایک عام سا انسان ہوں۔ ڈاکٹر وزیر آغا بہت بڑے ادیب اور بہت ہی بڑے انسان ہیں، نہیں سمجھ پایا کہ مجھ میں کون سی ایسی بات انھوں نے تلاش کر لی جو اس قدر انھیں متاثر کر گئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے لیے انہیں کا لکھا ہوا ایک شعر مجھے یاد آ گیا ———

وہ خوش کلام ہے ایسا کہ اس کے پاس ہمیں
طویل رہنا بھی لگتا ہے مختصر رہنا!

ڈاکٹر وزیر آغا، انور سدید اور شہزاد احمد سے ہوئی آج کی ملاقات اور ادبی گفتگو کا

ذکر نسرین رحمٰن سے ہوا اور کھانے کے بعد آج کی محفل تب میں ہم پاکستان کی ادبی سیاست پر باتیں کرتے رہے ایسی سیاست میں نسرین رحمٰن کی کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ کسی بھی ادبی گروہ بندی کا شکار نہیں ہوئیں ہر بڑے ادیب کے لیے اُن کے دل میں احترام تھا احترام کا یہی جذبہ ہے جو آدمی کو ایک بڑا انسان بناتا ہے۔

میرے دیش کی جمہوریت کا دن

آج ۲۶ جنوری کا دن تھا ———— بھارت میں دُنیا کے سب سے بڑے جمہوری دیس کا یوم جمہوریہ دھوم دھام سے منایا جاتا ہے آج نسرین رحمٰن کو کسی سرکاری میٹنگ کے سلسلے میں لاہور سے باہر جانا تھا آج سے کے دن بعد دوپہر میرے اعزاز میں ہوٹل پرل کانٹی نینٹل میں ایک بہت بڑی ادبی تقریب کا انعقاد کیا جانے والا تھا۔ یہ تقریب رائٹرز اینڈ انٹلیکچوئیل فورم آف پاکستان کی طرف سے منعقد کی جا رہی تھی جس کے لیے نہایت اعلیٰ پیمانے پر انتظامات کیے گئے تھے خوب صورت دعوتی کارڈ چھپوا کر انھیں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں تقسیم کیا گیا تھا مدعوئیں میں شاعر ادیب، صحافی، دانشور، علمی اور ٹیلی ویژن شخصیات اور ایسے بہت سارے لوگ تھے۔ نسرین رحمٰن نے اعتراف کیا تھا کہ لاہور میں ایسی شاندار تقریبات کا انعقاد بہت کم ہوتا ہے اس تقریب میں شریک ہونے کی شدید خواہش کے باوجود اُن کی مجبوری تھی کہ ایک نہایت ضروری سرکاری میٹنگ کے سلسلے میں انھیں لاہور سے باہر جانا تھا۔ روانگی سے قبل مسکراتے ہوئے انھوں نے کہا تھا ———— "یہ تقریب آپ کے یوم جمہوریت ہے ———— مبارکباد!" یہ محض اتفاق تھا کہ آج ہی کے دن میرے دیس کے شہر اور گاؤں گاؤں میں یوم جمہوریت منایا جا رہا ہوگا اور آج ہی کے دن یہاں لاہور میں میرے اعزاز میں اتنی بڑی تقریب منعقد کی جا رہی تھی ———— لیکن یہ اتفاق خوب صورت بنا جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ فخر سے میرا سر بلند ہوا جا رہا تھا کہ میں اُس دیش کا باسی ہوں جس کی مضبوط بنیاد جمہوریت پر ٹکی ہے۔ جس کی آزادی ہر شہری کی حقیقی آزادی ہے اور جس کا سیکولر کردار تمام عالم میں اپنی مثال آپ ہے اس کے برعکس پاکستان جو ہمارے دیش کی آزادی کے ساتھ ہی وجود میں آیا تھا، وہاں اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی جمہوری نظام قائم نہ ہو سکا تھا اس دیس کے عوام

فوجی حکومتوں کے سائے میں پرورش پا رہے تھے یہاں میری آمد سے چند ماہ قبل ہی مارشل لا ختم کر کے ایک محدود جمہوری نظام کا نفاذ کیا گیا تھا دل ہی دل میں میں نے دُعا کی کہ خدا پاکستانی عوام کو بھی ایک کھلی اور مکمل جمہوری آزادی کی فضا عطا فرمائے۔

عبداصغر کی لاہور آمد

شری سویرے ہی سفر پر روانہ ہو گئی تھیں بعد دوپہر منعقد ہونے والی تقریب سے قبل میرے پاس وقت ہی وقت تھا اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آج لاہور کے اندرونی علاقوں میں گھوموں گا، یہاں کے لوگوں سے ملوں گا اور یہاں کی عوامی اور سماجی زندگی کا مشاہدہ کروں گا۔ تیار ہو کر میں گھر سے روانہ ہونے ہی والا تھا کہ مشہور پاکستانی ادیبہ افسانہ نگار اور ناول نگار محترمہ عبداصغر کا ٹیلی فون آگیا۔ وہ خصوصاً اسلام آباد سے لاہور تشریف لائی تھیں اور آج کی تقریب میں شرکت کرنے والی تھیں عبداصغر سے ملنے کی میری شدید خواہش تھی چند ماہ قبل تک وہ لاہور میں مقیم تھیں اور مشہور ادبی جریدے ماہنامہ "تخلیق" کی مُدیرِ اعلیٰ تھیں۔ ان کے شوہر ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہیں لاہور سے اسلام آباد ان کی ٹرانسفر ہو جانے کے باعث عبداصغر کو بھی لاہور کو خیرباد کہہ کر اسلام آباد منتقل ہونا پڑا تھا۔ اس طرح "تخلیق" انھوں نے صدیقہ بیگم اور اظہر جاوید کو سونپ دیا تھا جو ادبی ماہنامہ "ادبِ لطیف" کی روح رواں تھیں ایک طویل عرصے سے عبداصغر سے میری خط و کتابت تھی اور گاہے گاہے تخلیق کے لیے میں لکھتا بھی رہتا تھا اس لیے عبداصغر کی لاہور آمد میرے لیے ایک خوش خبری تھی۔

عبداصغر کے بارے میں یہ جانکاری مجھے بعد میں ملی کہ اُن کی پیدائش دہلی میں ہوئی تھی اور اس طرح اپنے جنم کی زمین سے اُن کے جذبوں میں بے پناہ لگاؤ اور محبت ہے۔ اس طرح کی جذباتی محبت کا ہونا ایک قدرتی بات ہے اور ہر انسان کی جذباتی کمزوری بھی میں بھی تو اسی جذباتی رشتے کی کشش لیے پاکستان میں موجود تھا عبداصغر اردو کے علاوہ پنجابی زبان میں بھی لکھتی ہیں اب تک اُن کے سوسے زائد افسانے شائع ہو چکے ہیں "بیت جھڑ کا آخری پتا" ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے ان کا ایک ناول "دل کے رشتے" کافی مقبول ہوا ہے بعض افسانے کئی غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں ۱۹۶ کے بعد جو لوگ اُردو ادب میں لکھنے لگے اور ان میں سے جن خیدادیبوں نے اپنی خاص پہچان پیدا کی اُن

میں عدد را اصعرکا نام سرفہرست ہے۔

لاھور کے گلی کوچوں میں

گھر سے روانہ ہوتے وقت میں نے مقبول احمد دہلوی کو فون کیا آج دوپہر کا کھانا میں اُن کے ہاں کھانے کا وعدہ کر چکا تھا انھیں اطلاع دی کہ میں اُن کے دفتر دو بجے پہنچ جاؤں گا اور وہاں سے ہم گھر چلیں گے اس طرح چند گھنٹے مجھے تنہا گھومنے کا موقع مل گیا تھا ——— اور میں نے لاہور کے بازاروں سڑکوں اور آبادیوں میں گھوم کر اُس زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی تھی جس سے میں ابھی تک ناآشنا ہی تھا آئیے اُس زندگی کی ایک جھلک میں آپ کو بھی دکھاؤں۔

لاھور کی مال روڈ

لاہور دہلی کی طرح ایک بڑا شہر ہے لیکن اس کی آبادی دہلی سے کم ہے مجھے بتایا گیا کہ ایک اندازے کے مطابق اُس کی آبادی ۳۵ سے ۴ لاکھ کے درمیان ہے لاہور کی مال روڈ جسے اب شاہراہ قائداعظم کہا جاتا ہے، پہلے کی طرح اب بھی کافی کشادہ اور خوبصورت ہے اس پر بڑی بڑی عمارتیں واقع ہیں جن میں سے بعض کئی کئی منزلہ ہیں ان عمارتوں میں بڑے بڑے دفاتر اور شوروم ہیں بہت سے شاپنگ کمپلیکس بھی ان میں واقع ہیں ایسے تجارتی مراکز زیادہ تر انڈرگراؤنڈ اور ائیرکنڈیشنڈ ہیں ان میں سے اکثر عمارتوں کی تعمیر گذشتہ دو دہائیوں میں ہوئی ہے مال روڈ شہر کی سب سے خوبصورت سڑک ہے

پاکستان کے ہر بڑے شہر کی طرح لاہور میں بھی ٹریفک کنٹرول کا انتظام بہت کمزور ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عوام کو ٹریفک کے اصولوں کی یا تو کوئی جانکاری نہیں ہے اور یا انھیں کوئی پرواہ نہیں ہے اسی لیے وہاں سڑکوں پر حادثات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔

کاشتکاری

پاکستان نے زرعی میدان میں ترقی ضرور کی ہے لیکن صنعتی میدان میں کوئی قابل ذکر ترقی نہیں ہوئی وہاں گیہوں، چاول، گنے اور کپاس کی کاشت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے دیگر اجناس بھی کاشت

کی جاتی ہیں جو سبزیاں بھارت میں بوئی جاتی ہیں وہ تمام وہاں بھی بوئی جاتی ہیں پھلوں میں کینو کی کاشت وہاں بہت زیادہ ہوتی ہے اور بھارت کے مقابلے میں بہتر قسم کے کینو وہاں ملتے ہیں سیب بھی وہاں ملتے ہیں لیکن ان کی کوالٹی خاص نہیں ہوتی یہ سیب کشمیری ہوتے ہیں بھارت کے مقابلے میں ان کی قیمت وہاں زیادہ ہے چند برس پہلے تک کیلا پاکستان میں نہیں ملتا تھا اور اگر دستیاب ہوتا تھا تو اس کی قیمت وہاں دو روپے فی کیلا تک تھی لیکن اب سندھ کے علاقے میں کیلے کی کاشت کافی زیادہ ہونے لگی ہے۔ ذائقے میں لذیذ ہوتا ہے اور قیمت بھی کافی کم ہے بھارت کی طرح ہی موسموں کے پھل وہاں دستیاب ہیں

ڈرائی فروٹ یعنی خشک میووں میں صرف کاجو پاکستان میں نہیں ملتا باقی تمام خشک میووں کی وہاں افراط ہے اعلیٰ قسم کا کشمش ایک سو بیس روپے سیر چلغوزے تیس سے چالیس روپے سیر بادام تیس روپے سیر اور اخروٹ وجوہانی وغیرہ بھی بہت سستے ہیں مونگ پھلی بہت اچھی قسم کی اور بہت سستی ہے چھوٹی الائچی وہاں بازار ہی سے ملتی ہے اس میں سے مل نکالا ہوا ہوتا ہے اور اس کی قیمت بھی چھ سات سو روپے فی سیر سے کم نہیں ہوتی۔

قیمتی دھاتوں میں سونا بھارت کے مقابلے میں کچھ سستا ہے لیکن بہت زیادہ فرق نہیں ہے چاندی وہاں مہنگی ہے اور شاید اسی لئے اسمگل بھی ہوتی ہے عورتوں کو سونے کے زیورات پہننے کا کافی شوق ہے چاندی کے زیورات میں بھی ان کی کافی دلچسپی ہے

فیشن

مردوں کا عام لباس قمیص اور شلوار ہے بعض لوگ سوٹ بھی پہنتے ہیں لیکن مقابلتاً ان کی تعداد کم ہے یہ تبدیلی گذشتہ چند برسوں میں تیزی سے ہوئی ہے۔ عورتیں بھی زیادہ تر شلوار ہی پہنتی ہیں ساڑی خاص مواقع پر اور کم پہنی جاتی ہے عورتیں عموماً شوخ رنگ کے کپڑے پہنتی ہیں

لبس کی دوڑ میں پاکستانی عورت پیچھے نہیں ہے ہمارے ہاں مسلم خواتین کا جو تصور قائم ہے اس کے مطابق وہ برقعہ پہنے ہوئی چاہیئے لیکن پاکستان میں برقعہ شاید نادر ہی ہو گیا ہے جو بس حال ا متوسط خاندانوں کی پاکستانی عورتیں برقعہ بیساما لکل لپسند نہیں کرتیں کھلے ملتے بعض گھرانوں

میں اور یا پھر پاکستان کے دیہاتوں میں کہیں کہیں برقعہ پہنے عورتیں دکھائی دے جاتی ہیں ایسی عورتوں
کی تعداد کافی زیادہ ہے جو بال کٹواتی ہیں اور کئے گھرانوں کی محفلوں میں میں نے سگریٹ کے کش لگاتی کئی
عورتوں کو بھی دیکھا ہے

غیرملکی گاڑیوں کی بھرمار

پاکستان میں مختلف قسم کی جاپانی اور اور جدید دوسری غیرملکی گاڑیوں کی بھرمار ہے ایسی گاڑیاں
پاکستانی سڑکوں پر کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتی دکھائی دیتی ہیں دوسرے نمبر پر موٹر سائیکل اور
تیسرے نمبر پر اسکوٹر دکھائی دیتے ہیں لیکن بھارت کی طرح ان کی تعداد وہاں زیادہ نہیں ہے البتہ گاڑیاں
بھارت کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں بڑے شہروں میں سائیکل رکشا نہیں ہیں عام لوگ سائیکل کا
استعمال بھی بہت کم کرتے ہیں پاکستان میں سائیکل کی قیمت بارہ سو روپیے کے لگ بھگ ہے پاکستان
میں کوئی ایک بھی گاڑی، موٹر سائیکل یا اسکوٹر بنانے کی فیکٹری نہیں ہے یہ تمام غیرممالک سے درآمد
کی جاتی ہیں۔

پاکستان میں کپڑے کی صنعت آہستہ آہستہ فروغ پا رہی ہے وہاں کا مائیکرا استعمال ہے
لیکن کوالٹی کے لحاظ سے بہتر کپڑا بھارت میں ملتا ہے پاکستان میں ہوزری کی صنعت بھی فروغ پا رہی ہے
اسی طرح جوتے بھی پاکستان میں سستے ہیں

دیگر مصنوعات

الیکٹرانکس کا سامان اور زندگی کی عام ضرورت کی بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں سنگاپور سے
منگوائی جاتی ہیں اور بھارت کے مقابلے میں وہاں سستی ہیں اس کی دو بڑی وجوہات ہیں ایک یہ
کہ ایسی تمام چیزیں پاکستان میں نہیں بنتیں بلکہ غیرممالک سے درآمد ہوتی ہیں اور ان پر لگنے والے کسٹم کی شرح
کافی کم ہوتی ہے دوسرے یہ کہ پاکستان کی صنعتی پالیسی کافی لچک دار ہے اور بنیادی صنعت نہ ہونے کے
باعث یہاں کی مجبوری ہے اس کے برعکس بھارت میں ہر طرح کی اپنی صنعت ہے اور غیرممالک سے درآمدات
پر بھاری کسٹم چارج کیا جاتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ بھارت اپنے دیس کی مصنوعات کو ہر ممکن

طریقے سے فروغ دیا جاتا ہے۔

پاکستانی عوام ممالک میں

پاکستان میں امیر و غریب کے درمیان کی خلیج دن بدن بڑھ رہی ہے۔ روپیہ چند بڑے تجارتی گھرانوں کی تجوریوں میں بھر رہا ہے اور غریب زیادہ غریب ہوتا جارہا ہے۔ اس دوڑ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہی شاید پاکستان کی آبادی کا ایک قابلِ ذکر حصہ گلف اور یورپ کے دیشوں میں جاکر کام کرنے کے لیے مجبور ہوا ہے۔

منشیات کی اسمگلنگ

مارشل لا کے باوجود پاکستان میں ہونے والے جرائم کی تعداد کافی زیادہ ہے منشیات کی اسمگلنگ بہت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ اس برائی کو خود پاکستان سرکار بھی تسلیم کرتی ہے اور دور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش بھی کر رہی ہے بھارت ہی کی طرح پاکستان میں بھی زندگی کے الگ الگ ہر شعبے میں کرپشن کا بول بالا ہے برطانوی حکومت کے جاتے اور آزادی کے بعد سے اس میدان میں ہم کچھ زیادہ ہی آزاد ہوگئے ہیں۔

آبادی میں اضافہ

آبادی میں لگاتار ہو رہے اضافے کا شکار پاکستان بھی ہے دراصل یہ ایک عالمی مسئلہ ہے خاص طور پر بھارت میں یہ آواز بلند ہوتی رہی ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک نظریۂ اسلام کے خلاف ہے اسلامی ملک پاکستان میں دیکھنے کو ملا کہ وہاں کی حکومت بڑھ رہی آبادی پر قابو پانے کے لیے سرکاری اور سماجی سطح پر کافی کام کر رہی ہے پڑھے لکھے عوام میں وہاں بیداری کی لہر ہے لیکن کم تعلیم یافتہ لوگوں اور پسماندہ طبقوں میں یہ مسئلہ کافی سنجیدہ ہے

پاکستان کے دیہی علاقوں میں ترقی کی رفتار کافی سست ہے بھارت کی طرح پاکستان بھی دیہاتوں کا دیش ہے بھارت کے دیہاتوں کی زندگی میں دیش کی آزادی کے بعد نمایاں تبدیلی آئی ہے پانی، بجلی، طبی، تعلیمی اور ایسی بہت سی سہولیات کے علاوہ سڑکوں کا جال پھیلا ہے زراعت کے

میداں میں جدید ٹیکنک طریقوں اور زرعی ریسرچ کی مدد سے تو جیسے انقلاب ہی آگیا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کے دیہات آج بھی پس ماندگی کا شکار ہیں اور وہاں ایسی بہت سی سہولیات کا فقدان ہے۔

پاکستان میں ہندو

پاکستان میں سندھی ہندو اور عیسائی بھی رہتے ہیں لیکن اُن کی تعداد بہت کم ہے بعض صوبائی اسمبلیوں اور وفاقی حکومت میں انہیں نمائندگی حاصل ہے لیکن یہ بس محض برائے نام ہے پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے۔ وہاں کی حکومت اسلامی ہے قانون اور قواعد بھی اسلامی ہیں۔ ہندوؤں یا عیسائی انہیں اسی نظام کے تحت رہنا اور جینا ہے۔ لاہور میں ہندوؤں کے محض چند ایک گھر ہیں۔ عیسائیوں کی تعداد کافی ہے میں دیکھ تو نہیں سکا سنا تھا کہ لاہور میں ایک مندر ہے جس کی حالت قابلِ رحم ہے گرجا گھر اور عیسائیوں کے اپنے تعلیمی ادارے ہیں جن کی دیکھ بھال وہ مناسب ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ لاہور میں گوردوارہ ہے پاکستان کے دیگر حصوں میں بھی تاریخی اہمیت کے کئی گوردوارے ہیں اگرچہ ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ایک قومی وقف بورڈ کے تحت ہے لیکن ان کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا جاتا ظاہر ہے کہ جہاں ان مقدس جگہوں کی باقاعدہ پرستش کرنے والے نہیں ہوں وہاں ان کی دیکھ بھال مناسب ڈھنگ سے ہو ہی نہیں سکتی مقدس گوردواروں کی زیارت کے لیے سال میں تین چار مرتبہ بھارت اور کئی دوسرے ملکوں سے سکھ پاکستان کی یاترا پر کافی بڑی تعداد میں جاتے ہیں تب ان مقدس جگہوں کی طرف وقف بورڈ کا دھیان جاتا ہے

کٹاس راج

ہندوؤں کا ایک بہت ہی اہم اور مقدس تیرتھ شری کٹاس راج بھی پاکستان میں واقع ہے وہاں ہندوؤں کی کوئی آبادی نہیں ہے بھارت کی نمائندہ ہندو جماعتوں کی طرف سے ایک طویل عرصے سے یہ مانگ کی جاتی رہی ہے کہ انہیں اس مقدس تیرتھ کی یاترا کی اجازت دی جائے جہاں تک میری جانکاری ہے گذشتہ برس ہندو تیرتھ یاتریوں کا پہلا جتھہ شری سب سال متل ممبر پارلیمنٹ کی رہنمائی میں کٹاس راج

کی مانند لگا تھا۔

شراب نہیں

پاکستان میں شراب کی خرید و فروخت اور استعمال پر مکمل پابندی عائد ہے وزیراعظم مرحوم بھٹو کے زوال کے بعد صدر ضیاء نے جب اقتدار سنبھالا تو انہوں نے یہ قدم اٹھایا تھا ایک پاکستانی باشندے نے مجھے بتایا کہ جس روز مکمل شراب بندی کا اعلان ہوا تھا اس روز لوگوں نے شراب کے مٹکوں میں سے شراب کی بوتلیں اٹھا کر سڑکوں پر توڑ دی تھیں اور یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سڑکوں پر شراب کی بارش ہوئی ہو اب پاکستان میں کہیں بھی شراب کی عام دوکانیں نہیں ہیں ہر بڑے شہر یعنی لاہور اسلام آباد کراچی وغیرہ میں ایک ایک منظور شدہ دوکان ہے جہاں سے پرمٹ حاصل کرنے کے بعد عیسائیوں اور غیر مسلم غیر ملکی سیاحوں کو شراب مل سکتی ہے یہ لوگ بھی شراب کا استعمال صرف اپنے گھروں کے اندر ہی کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی شراب پی کر سڑکوں پر گھومتا پکڑا جاتا ہے تو اُسے سر بازار کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ اس پابندی کا اثر عام لوگوں پر پڑا ہے لیکن کئی امیر لوگ اب بھی شراب پیتے ہیں کیونکہ زائد رقم خرچ کرکے انہیں اسمگل شدہ وہسکی دستیاب ہو جاتی ہے۔ عموماً اس طرح کے کام پچھلے دروازوں سے ہوتے ہیں یقیناً ایسے لوگوں کی تعداد کم ہو گی شراب مضرِ صحت تو ہے ہی ایک بڑی سماجی لعنت بھی ہے کاش کہ گاندھی کے بھارت میں بھی اس بُرائی کو ختم کیا جا سکتا۔

کوڑوں کی سزا

کوڑوں کی سزا پر بات چلی تو ڈرائیور کرنے پر ایک صاحب نے بتایا کہ بدکاری کرنے والے لوگوں کو کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے کئی دوسرے سماجی اور قانونی جرائم کے لئے بھی ایسی سزا تجویز کی جاتی ہے لیکن اس کا کہنا تھا کہ ایسے واقعات کم ہی ہوتے ہیں۔ اُس نے کسی کو سر بازار کوڑے لگتے ابھی تک نہیں دیکھے تھے محض اخبار ہی میں پڑھا تھا۔

اُردو شاعری میں شراب کا ذکر نہیں

شراب کے ذکر کے ساتھ مجھے ایک اور بات یاد آگئی کہ پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں اب شراب لفظ کا کہیں ذکر نہیں ہوتا شاعر، شاعری اور شراب کے تعلق سے بہت سے قصے مشہور ہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ اُردو شاعری میں مے اور میکدوں کا ذکر اکثر ہوتا تھا لیکن پاکستان کی اُردو شاعری آج مے کے ذکر سے محروم ہے لیکن اس کے باوجود شاعر خوب صورت شعر کہہ رہے ہیں۔

پُرانے نام زندہ ہیں

پاکستان اور خصوصاً لاہور کے کئی بازار، سڑکیں اور آبادیاں آج بھی ہندوؤں کے ناموں سے منسوب ہیں کرشن نگر، موہن نگر، دھنی رام روڈ ـــــ وغیرہ پُرانے وقتوں سے چلے آرہے یہ نام یا تو تبدیل نہیں کیے گئے اور اگر تبدیل کیے گئے ہیں تو نئے نام مقبول نہیں ہو سکے

گوشت خوری کی عادت

پاکستان میں اکثر لوگ گوشت خور ہیں یہاں تک کہ دال اور بینگن کی ترکاری میں بھی بوٹی نظر آتی ہے مُرغ کا گوشت بہت مہنگا ہے اور بڑے گھرانوں میں بھی یہ ہفتہ میں ایک یا دو بار سے زیادہ نہیں پکتا عام طور پر لوگ بکرے کا گوشت کھاتے ہیں بڑے جانوروں کے گوشت کو "بڑا گوشت" کہا جاتا ہے اور سستا ہونے کے باعث غریب گھرانوں میں عموماً یہی گوشت پکتا ہے

چائے اچھی نہیں

پاکستان میں ملنے والی چائے کی کوالٹی زیادہ اچھی نہیں ہے اس مُلک میں چائے کی کاشت نہیں ہوتی اور یہ باہر سے منگوائی جاتی ہے لیکن بھارتی چائے کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ یہ بات کافی کے بارے میں کہی جاسکتی ہے اسے پاکستان میں قیام کے دوران مجھے بھارتی چائے کی طلب رہی۔

مہنگائی

پاکستان میں ہر طرح کی مزدوری بہت مہنگی ہے ایک گھریلو نوکر یا باورچی کی ماہانہ تنخواہ پندرہ سولہ سو روپے ہے۔ کوٹھیوں میں عورتیں دو تین دن کام کرنے والے سو سیر چھ سات سو روپے ماہوار لیتے ہیں کار چلانے والے ڈرائیور کی تنخواہ بھی ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار سے کم نہیں ہے جن درجنوں دوستوں سے پاکستان میں میں ملا ان میں سے اکثر کے پاس اپنی گاڑیاں ہیں لیکن گاڑی وہ خود ہی ڈرائیو کرتے ہیں۔

لاہور کی اندرون شہر کی آبادیوں اور بازاروں میں بہت زیادہ بھیڑ بھاڑ رہتی ہے دہلی کے صدر بازار، جامع مسجد، بلیماراں وغیرہ علاقوں کی طرح یہاں بھی خوانچے اور ریڑھی والوں کی بھرمار ہے۔ یہاں صفائی کا بھی مناسب انتظام نہیں ہے۔ نئی آبادیاں صاف ستھری اور خوبصورت ہیں

ٹرانسپورٹ

پاکستان میں ٹرانسپورٹ زیادہ تر پرائیویٹ کمپنیوں کے پاس ہے لاہور سے اسلام آباد، راولپنڈی سرگودھا، ساہیوال، ملتان اور دوسرے شہروں اور قصبوں کو جانے والی موٹر کاریں زیادہ تر پرائیویٹ ہیں اور سرکاری بسوں کے مقابلے میں ان کی حالت اور سروس بہتر ہے۔ مقامی طور پر چلنے والی منی بسیں تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور یہ بھی پرائیویٹ ہیں رکشا تو کہیں دکھائی نہیں دیتا البتہ تانگے کہیں کہیں دکھائی دے جاتے ہیں۔ پہلے کی طرح وہاں اب تانگوں کی بھرمار نہیں ہے۔

بجلی کی کمی

لاہور میں بجلی سپلائی کی ذمہ داری، واپڈا نام کے ایک سرکاری ادارے کے سپرد ہے لیکن بجلی سپلائی کا انتظام نہایت ناقص ہے موسم سرما کے جنوری اور فروری کے مہینوں میں میں پاکستان میں تھا اس موسم میں بجلی کی گھر یلو کھپت عام طور پر کافی کم ہوتی ہے اس کے باوجود، بار صبح سے شام تک آٹھ دس گھنٹے روزانہ بجلی کی کٹوتی لاگو تھی گرمی کے موسم میں کیا حال ہو، وہ اس کا اندازہ ہو سکتا ہے لگایا جا سکتا ہے بجلی کی قلت کے لیے پاکستان میں جنریٹروں کا استعمال عام ہوتا ہے۔

لذیذ کھانا

مدرسہ بالا ان تمام جیزوں کا علم مجھے آرادانہ طور پر لاہور گھومے اور عام لوگوں سے بات جیت
کے بعد ہوا کلائی کی گھڑی پورے دو کا وقت دے رہی تھی اور دو کے مجھے مقبول احمد دہلوی کے گھر پہنچنا تھا
مقبول کی رہائش گاہ بست روڈ پر واقع ہے مال روڈ سے وہاں پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔
مقبول دوپہر کے کھانے کے لیے میرے منتظر تھے میری فرمائش پر بھابی صاحبہ نے صرف سبزیاں اور ترکاریاں
ہی تیار کی تھیں جو تعداد میں کئی تھیں۔ دہی بڑے انھوں نے خاص طور سے بنائے تھے کھانا اس قدر لذیذ تھا
کہ بھوک نہیں ہوتے ہوئے بھی میں بہت زیادہ کھا گیا تھا۔ بعد دوپہر تین کے ہوٹل پرل کانٹی نینٹل کی تقریب
میں پہنچنا تھا اس لیے آج بھی بچوں کے ساتھ میں زیادہ وقت نہیں رہ سکا تھا۔ مقبول بھائی اور بھابی کا شکریہ
حق بجانب تھا

رائٹرز اینڈ انٹلکچوئل فورم آف پاکستان کی طرف سے اعزازی تقریب

جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے میرے اعزاز میں بہت بڑے پیمانے پر ہوٹل پرل کانٹی نینٹل میں تقریب کا
انعقاد رائٹرز اینڈ انٹلکچوئل فورم آف پاکستان کی طرف سے کیا گیا تھا مقبول دہلوی کے ساتھ بعد دوپہر
تین بجے میں وہاں پہنچ گیا تھا منتظمین میں جناب اختر مسعود شیخ اور جناب سید سرفراز احمد نے ہمارا
استقبال کیا کافی لوگ تشریف لا چکے تھے اور مجھے بتایا گیا کہ مزید بہت سے لوگوں کی آمد کا بھی ابھی انتظار ہے
مجھے زیادہ حیرانی نہیں ہوئی کیوں کہ پاکستان میں اپنے دنوں تک کے قیام کے بعد اب تک مجھے کچھ اندازہ ہو چکا
تھا کہ ہم دونوں دیشوں کے باسیوں میں جو بہت سی باتیں مشترک ہیں ان میں ایک وقت کا پابند نہیں ہونا
بھی ہے اس عادت کا شکار عام آدمی سے زیادہ شاید بڑے لوگ، بڑے افسر اور بڑے سماجی
لیڈر اور وزیر زیادہ ہیں۔

تقریب شروع ہوئی تو حاضرین سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جن ممتاز لوگوں نے اس تقریب میں
شرکت کی ان میں جناب عطاء الحق قاسمی، ڈاکٹر سلیم اختر، امجد اسلام امجد، سائرہ ہاشمی، عبدالاصغر صدیقہ

جاوید اکبر کاظمی، دلدار پرویز بھٹی، یامین واسطی، حسن رضوی، مبارک احمد، ڈاکٹر حسن اختر مقبول دہلوی تبسم بٹ، ہجویری بھٹی، مرتضیٰ عادل، سعادت وحید، شاہد واسطی، حبیب احمد، میاں سجاد اسلم رسیدی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ پاکستانی فلموں اور ٹیلی ویژن سے وابستہ بہت سے لوگ بھی موجود تھے لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے ہال میں اندھیرا تھا جسے بڑی حد تک دور کیا جاسکتا تھا لیکن ماحول کو شاعرانہ اور دلکش بنانے کے لیے تیرہ موم بتیوں کا سہارا نہیں لیا گیا تھا ہال میں چاروں طرف بڑی بڑی موم بتیاں شمع کی طرح جل رہی تھیں اور دھیمی موسیقی کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ تقریب کو اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ سب سے پہلے میری خوبیوں اور خامیوں کا بڑے خوب صورت انداز میں ذکر کیا گیا چند تقریریں کی گئیں مجھے ایک افسانہ پڑھنے کے لیے کہا گیا اور پھر میرے افسانے پر بہت کھل کر باتیں ہوئیں تعارف آپس میں بات چیت کا دور شروع ہوا جس میں اردو ہندی اور پنجابی رسائل و ادب، بھارت اور پاک کی فلمیں اور ٹیلی ویژن پروگرام، صحافت، کلچرل سرگرمیاں، دونوں ملکوں کے آپسی تعلقات ـــــ غرضیکہ سیاست کو چھوڑ کر لگ بھگ ہر دوسرا موضوع زیر گفتگو آیا ـــــ اور تقریب کے اختتام پر ایک پُرتکلف دعوت سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ بہت سے دوستوں نے مجھے اپنی کتابوں کے تحائف دیے اور دیگر کئی قسم کے تحفوں سے بھی کئی دوستوں نے مجھے نوازا۔

جذبات کا ردِ عمل

پاکستان میں اب تک بہت سے دوستوں سے میری ملاقات ہو چکی تھی، دعوتوں اور محفلوں کا اہتمام کیا گیا تھا اور ہر جگہ سے دونوں ملکوں کے درمیان خوش گوار تعلقات اور دوستی کی باتیں کہی گئی تھیں۔ آج کی تقریب میں جان بوجھ کر میں نے اپنا افسانہ "ہم دونوں" پڑھا تھا تاکہ جذبات کا ردِ عمل کھل کر سامنے آسکے یہ افسانہ بہت برس پہلے میں نے بھارت اور پاکستان کے درمیان ہوئی دوسری جنگ کے پس منظر میں لکھا تھا ایک ہندو اور ایک مسلمان اس کہانی کے حوالے کردار ہیں جن کے خاندانوں نے پہلے دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں کا درد سہا، پھر ملکی تقسیم کا شکار ہو کر دو خاندانوں کی جدائی کا غم برداشت کیا اور پھر دونوں ملکوں کے درمیان جنگ نے دوست اور دشمن کی حیثیت میں دونوں کو آمنے سامنے

لاکر کھڑا کر دیا، لیکن کوئی بھی سمجھ نہیں پایا کہ کون کس کا دشمن ہے ——— جنگ بڑکر ہم دوستوں اور محبتوں کو اُس کی آگ میں جُھلسنے کے لیے کیوں چھوڑ دیتے ہیں ——— ؟ یہ ایک نہایت نازک موضوع پر لکھی گئی کہانی تھی اور اُسے پڑھنے کے بعد وہاں موجود ادیبوں، شاعروں، فن کاروں اور دانش وروں کے درمیاں ہوئی بحث کو نہایت خاموشی سے میں نے سُنا تھا وہاں موجود یہ لوگ امریکہ، روس، چین اور ان کی سیاسی دخل اندازیوں کو شاید بھول گئے تھے اور آپسی پیار، محبت، خلوص اور دوستی کے جذبوں کے ساگر میں ڈوبے انھیں رشتوں کی باتیں کر رہے تھے۔ مدھم روشنی میں بھی بہت سی نم آنکھوں کو میں نے دیکھا تھا اور اُن آنسوؤں کو بھی جو رخساروں پر لکیروں کے نشاں چھوڑتے ہوئے ڈھلکے تھے۔ تب میرے وشواس کو طاقت ملی تھی کہ دونوں دیشوں کے درمیاں عوامی سطح پر محبت اور دوستی کی خواہش محض اظہارِ تکلف نہیں بلکہ ٹھوس حقیقت ہے وہ وقت یقیناً آئے گا جب محبتوں اور دوستیوں کے ان رشتوں کو باقاعدہ ایک پہچان ملے گی ——— !

اس تقریب میں ایک بڑی تعداد ان نوجوان ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کی بھی تھی جو کبھی بھارت نہیں آئے تھے ——— بھارت آنے کی جن کی شدید خواہش تھی اور بھارت کی ادبی، سماجی اور ثقافتی زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں وہ بہت کچھ جاننے کے خواہاں تھے۔ آپسی بات چیت کے دوران اُن لوگوں نے بے شمار سوال مجھ سے کیے تھے اور میں نے اپنی جانکاری کے مطابق انھیں جواب دینے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

مختلف موضوعات پر ہوئی چند خاص باتوں کا ذکر کرنا یہاں میں ضروری سمجھتا ہوں۔

بھارت میں اردو

ادب اور زبان کے حوالے سے پوچھے گئے سوالات کا جواب دیتے ہوئے میں نے بتایا تھا کہ ہندی بھارت کی قومی زبان ہے لیکن آزادی کے چالیس برس گذر جانے کے بعد بھی قومی زبان کو ہم اس کا صحیح مقام نہیں دے سکے لگ بھگ بھارت کے ہر صوبے کی ایک اپنی علاقائی زبان ہے اور ہم اس زبان سے مقابلتاً زیادہ جُڑے ہوئے ہیں مثال کے طور پر بھارتی پنجاب میں گورمکھی، ہماری مادری اور علاقائی زبان ہے۔ اسی طرح بنگال میں بنگلہ بھاشا ہے۔ گجرات میں گجراتی اور تامل ناڈو

مادری زبان ہے محنت کار سنة

میں تامل زبان ہے اور اسی طرح مختلف صوبوں کی صوبائی زبان ہے ملاتہ۔ ہندی زبان کے پھیلاؤ

ہوتا ہی ہے لیکن قومی زبان ہماری قومیت کی اوّلیں نشانی ہونی چاہیے۔ لیکن انگریزی زبان کا

کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر اور وسیع پیمانے پر سنجیدہ کوشش ہو رہی ہے لیکن وہاں بھی انگریزی زبان اُردو

تسلط آج بھی قائم ہے مجھے بتایا گیا کہ اُردو پاکستان کی قومی زبان ہے رسم الخط میں رائج ہے یہاں وہاں بولی

پر آج بھی بھاری ہے۔ پاکستانی پنجاب میں پنجابی زبان اُردو اور ادب بھی تخلیق ہوتا ہے

لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔ پنجابی میں فلمیں بھی بنتی ہیں سب سے سوال کیے گئے کسوں کہ مرا

بھارت میں اُردو زبان و ادب کے بارے میں مجھ سے اور پروان چڑھی تھی اس لیے

تعلق بھارتی سماج سے ہے اور کہا جاتا ہے کہ اُردو پنجاب کی دھرتی پر جنمی سے سوال پوچھے گئے۔ میں

بھارتی پنجاب میں اُردو زبان و ادب سے متعلق خاص طور سے مجھ سے چند مخصوص علاقوں کو چھوڑ کر

نے تسلیم کیا کہ بھارتی پنجاب میں اُردو دھیرے دھیرے ختم ہو رہی ہے۔ نئی نسل کے لوگ اُردو

جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے، اُردو کسی بھی اسکول میں ذریعہ تعلیم نہیں ہے۔ شمالی بھارت کا

لکھنا پڑھنا عموماً نہیں جانتے پُرانے وقتوں کے لوگوں کو اُردو سے آج بھی عشق ہے حالیہ اعداد و شمار

سے بڑا اُردو اخبار روزانہ ہند سماچار جالندھر (پنجاب) ہی سے شائع ہوتا ہے روزانہ "ملاپ" اور روزانہ

کے مطابق بھارت میں سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار ہے اس کے علاوہ لدھیانہ (پنجاب) سے

"پرتاپ" اخبارات بھی پنجاب میں شائع ہوتے ہیں ساحر لدھیانوی کے شہر "تعاون" ـــــ "مدار"

متعدد روزانہ و ہفتہ وار مقامی اخبارات شائع ہوتے ہیں جس میں ہفتہ وار پنجاب کے دوسرے شہروں سے بھی اُردو

"سماج" اور "رجحان" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں اسی طرح اُردو غزلوں اور مشاعروں

اخبارات شائع ہوتے ہیں نئی نسل کے نوجوان جو اُردو نہیں جانتے وہ بھی ہند اُردو مشاعرے

میں کافی دلچسپی لیتے ہیں۔ آج بھی پنجاب کے ہر بڑے شہر میں ہر سال کُل

منعقد ہوتے ہیں

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ محکمہ تعلقاتِ عامہ پنجاب سرکار کی طرف سے اُردو ماہنامہ "پاسبان"

اور محکمہ السنہ (بھاشا وبھاگ) پنجاب سرکار کی طرف سے ماہنامہ "پروازِ ادب"، شائع ہو رہا ہے

یہ دونوں جریدے ادبی اور معلوماتی ہیں سرکاری سطح پر ہر بڑے شہر میں اُردو پڑھنے کے مراکز بھی

قائم کیے گئے ہیں جہاں سائنٹسٹ اُردو پڑھنا لکھنا سیکھ سکتے ہیں محکمۂ السنہ پنجاب کی طرف سے ہر سال اُردو ادیبوں کو کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی گرانٹ دی جاتی ہے اور بہترین اُردو کتابوں پر انعامات بھی دیے جاتے ہیں لیکن یہ سب مُردہ جسم کو آکسیجن دینے والی بات ہے کیوں کہ اُردو کو سرکاری طور پر زندہ رکھنے کے لیے یہاں سرکاری سطح پر کوئی کام نہیں ہوا آکسیجن کے سہارے اُردو شاید یہاں چند برس اور زندہ رہ لے گی ——— اور پھر شاید اُردو کے مزار پر عقیدت کے پھول چڑھانے کا رسمی سلسلہ جاری ہو جائے گا

بھارت کے دیگر صوبوں میں اُردو کے بارے میں بھی کئی سوال دریافت کیے گئے اور اپنی جانکاری کے مطابق میں نے انہیں حقیقی صورت حال سے آگاہ کیا بہار میں اُردو دوسری سرکاری زبان ہے اس سلسلے میں اتر پردیش میں تحریک جاری ہے۔ درجن بھر ریاستوں میں اُردو اکادمیاں قائم ہیں جو بھاری سرکاری گرانٹوں سے اُردو کے لیے کچھ نہ کچھ کام کر رہی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں عملی طور پر کام اتنا نہیں ہو رہا سرکاری روپے سے مشاعرے، سیمینار، درکتابی انعامات کی تقسیم اور اسی طرح کے نمائشی پروگراموں سے تو اُردو کو زندہ نہیں رکھا جا سکتا اس ضمن میں زیادہ سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے

بھارت کے غیر مسلم اُردو ادیب

ایک تاثر یہ تھا کہ بھارت میں اُردو مسلمانوں کی بدولت زندہ ہے اور اسی سلسلے میں کئی طرح کے سوالات بھی کیے گئے۔ میں نے واضح کیا کہ یہ حقیقت نہیں ہے بھارت میں آج بھی اُردو کو سیکولر حیثیت حاصل ہے اور ایسے ادیبوں کی فہرست بہت طویل ہے جو غیر مسلم ہیں اور اُردو زبان میں برابر لکھ رہے ہیں مثال کے طور پر میں نے جب گوندر پال رام لعل، رتن سنگھ، کشمیری لعل ذاکر وغیرہ کا ذکر کیا تو میں پڑھیوں کے سامنے افسانہ نگار ہیں اور ان کے لکھنے کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی جاب ظفر پیامی گوپال متل سریندر پرکاش طرح میرا کمار پاشی، ترون کمار ورما، گوربچن سنگھ، ستیش بترا ستیندر پردیپ، بلکر تو سوی، سریندر گوتم جماداس اختر مس ارچ رہبر دلویندر ستیارتھی وغیرہ اُردو شعر کے ممتاز نام ہیں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، کالی داس گپتا رضا، مالک رام

ڈاکٹر گیان چند جین وغیرہ کی قابلِ قدر اُردو خدمات اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ اُردو شاعری میں بھی غیر مسلم شعرا کی فہرست بہت طویل ہے اسی طرح صحافت کے میدان میں بھی غیر مسلم اُردو صحافیوں نے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں

میں نے بتایا کہ چند برس قبل مشہور افسانہ نگار جناب رام لعل کے زیرِ اہتمام لکھنؤ میں غیر مسلم اُردو ادیبوں کی ایک کُل ہند کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں بہت بڑی تعداد میں ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی تھی اس موقع پر غیر مسلم اُردو مصنفین کی ایک فہرست بھی شائع ہوئی تھی جس میں ہزاروں کی تعداد میں نام درج تھے اس کی ضرورت تب اس لیے محسوس ہوئی تھی کہ پاکستان کی طرح بھارت میں بھی یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ اُردو مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے اور بھارت میں اب زیادہ تر مسلم ادیب ہی اُردو زبان میں ادب تخلیق کر رہے ہیں لکھنؤ کی اس کانفرنس نے اسی تاثر کو ختم کرنے میں بہت مدد دی تھی میں نے یہ بھی بتایا کہ بھارت کے صوبہ اُتر پردیش میں ان دنوں اُردو کے حق میں جو تحریک چل رہی ہے اس کے راہنماؤں میں افسانہ نگار رام لعل کا نام سرِفہرست ہے۔

بھارتی پنجاب کے اُردو قلم کار

ایک سوال یہ تھا کہ بھارتی پنجاب میں اس وقت کون کون اُردو ادیب اور شاعر ہیں جو باقاعدگی سے لکھ رہے ہیں میں نے اپنے علاوہ شرن کمار ورما اور جناب ایس کے راہیاں کا ذکر کیا جو اُردو کے مقبول افسانہ نگار ہیں اور جن کی کہانیاں ہندوپاک کے صفِ اوّل کے رسالوں و جریدوں میں شائع ہوتی ہیں جناب کرتن ادیب، مہاشے چیتر کار، پرسین تخت سنگھ اور پورن سنگھ ہُنر اُردو کے معروف اور بزرگ شاعر ہیں جناب امر جیت قیس کا نام بھی اسی صف میں آتا ہے پروفیسر آزاد گلاٹی ۔۔۔ اُردو کے مشہور شاعر اور نقاد ہیں جناب آر۔ ڈی شرما تاثیر، پریم کمار نظر، مہر گیرا، جگر جالندھری، ہر بھگوان شاد، شام داس کھنہ، راجندر ناتھ رہبر، پرویش کمار اشک، ڈاکٹر جون اکبر اہی، ساحر لدھیانوی، بالی ادری، سوشیل اختر وغیرہ بہت سے قابلِ ذکر نام ہیں جن کا تعلق پنجاب سے ہے۔ نشتر ناصر کوٹلوی، محمود عالم، خالد کمات حسوب، سنگھ راج، وید دیوانہ وغیرہ بھی پنجاب میں رہ کر اُردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

یونیورسٹی کو مرکز کر کے زیرِ انتظام ہے لیکن یہ یہاں کی راجدھانی ہے۔ اور کشمیری لال ذاکر، ڈاکٹر ہارون ایوب، ستیہ پال آنند، ڈاکٹر ریشی، پروفیسر ایچ۔ ایس دلگیر، سورج سویرا، ستیہ پرکاش سنگر، سریندر ریاٹ سورا، پرکاش ناتھ پرویز، ما واکرش گوپال معصوم، ستیہ نند شاکر وغیرہ بہت سے ادیب اور شاعر یہاں مقیم ہیں اور اُردو دنیا میں جن کے نام کی پہچان ہے۔

برطانیہ میں ایسے اُردو قلم کاروں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے جو پنجاب سے باہر مقیم ہیں اور اُردو سے ناطہ جوڑے ہوئے ہیں معروف افسانہ نگار جناب ہرچرن چاولہ ناروے میں ہیں۔ جتیندر بلو لندن میں مقیم ہیں اور دونوں حضرات نہ صرف پنجابی ہیں بلکہ صفِ اوّل کے اُردو افسانہ نگار ہیں۔ شعرا میں جناب سوہن راہی اور راج کھیتی بھی پنجابی ہیں جو لندن میں مقیم ہیں۔ اسی طرح بہت سے دوسرے پنجابی شاعر اور ادیب ہیں جو بھارت سے دُور مختلف ممالک میں قیام پذیر ہیں اور اُردو کی خدمت کر رہے ہیں۔

ترقی پسند تحریک

ترقی پسند تحریک کا ذکر چلا تو میں نے بتایا کہ اس عظیم تحریک کا نام ہے کر اپنی پہچان بنانے رکھنے والے چند لوگ بھارت میں آج بھی زندہ ہیں ورنہ عملی طور پر تحریک ختم ہو چکی ہے۔ پچھلے دنوں بھارت میں اس تحریک کے پچاس سالہ جشن منائے گئے اس سے قبل ایک بہت بڑا جشن لندن میں بھی منایا گیا تھا میرے خیال میں تو ایسے جشن گذرے ہوئے وقتوں کو یاد کرنے کے لیے ہی منائے گئے ہیں جن حالات اور جس دَور میں اس ادبی تحریک کا جنم ہوا تھا تب اس کی اہمیت اور افادیت بھی۔ حالات آج بدل گئے ہیں انجمن ترقی پسند تحریک کے راہنماؤں نے اپنے آپ کو ایک خاص دائرے میں قید کر لیا ہے۔ ایسے میں اس کی تڑپیں کھوکھلی ہو گئی ہیں۔ اس کا دائرہ بھی محدود ہو کر رہ گیا ہے اسے تو ایک سمندر رہنے۔ بھلا سمندر کو بھی کسی محدود دائروں میں قید کیا ہے متحدہ ہندوستان میں لاہور اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا ایک بڑا مرکز تھا اور ماہنامہ "ادبِ لطیف" اور "سویرا" جیسے ادبی جریدے اس تحریک کے پرچم تھے لیکن آج وہاں اس تحریک کو مکمل طور پر کمیونسٹ سیاست کا حصہ تصور کرتے ہوئے ختم کیا جا چکا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ پاکستان کا کوئی بھی ادیب آج ترقی پسند تحریک سے وابستگی کا کھلے طور پر اظہار تک کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا یعنی

وہاں اس تحریک کے نام پر آج کوئی جشن منانے والے لوگ بھی نہیں ہیں

بھارت کے اُردو جریدے

بھارت میں شائع ہونے والے اُردو ادبی جریدوں کے بارے میں پوچھے جانے پر میں نے بتایا کہ
مقبول ترین جریدے ماہنامہ "شمع" اور "بیسویں صدی" صرف دو ہی ہیں علمی رسالہ ہونے کے باوجود
"شمع" میں اُردو کے صفِ اوّل کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں اسی طرح ماہنامہ
"روبی" بھی کافی مقبول ہے ماہنامہ "بانو" (خواتین کا رسالہ) ماہنامہ "کھلونا" اور "پیامِ تعلیم" (بچوں کے
رسالے) موقر "استعارہ" اور خالص ادبی پرچوں میں "آج کل" ـــ "شاعر" ـــ "ستاں ہند" ـــ
"ہماری زبان" ـــ "کتاب نما" ـــ "شب خون" ـــ "الفاظ" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کافی تعداد
اُردو ڈائجسٹ "شبستان" اور "ہما" بھی کافی تعداد میں شائع ہوتے ہیں پاکستان کے ادبی رسالوں
میں پرچے بھارت میں شائع ہوتے ہیں لیکن ان کی اشاعت زیادہ نہیں ہے "ادبِ لطیف" ـــ "سیپ" ـــ "فنون" ـــ
"اوراق" ـــ میں "نقوش" ـــ وہاں بے شمار دوسرے
"افکار" ـــ "نیا دور" ـــ وغیرہ صفِ اوّل میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہاں بے شمار دوسرے
رسالے اور ڈائجسٹ شائع ہوتے ہیں سرکاری رسالہ "ماہِ نو" ایک معیاری ادبی جریدہ ہے

بھارتی فلمیں

فلموں کی باتیں ہوئیں تو میں نے بتایا کہ بھارت فلم سازی کے میدان میں دنیا کا دوسرا بڑا دیس
ہے زیادہ تر فلمیں ہندوستانی زبان میں بنائی جاتی ہیں لیکن علاقائی زبانوں میں بننے والی فلموں کی
تعداد بھی کافی ہوتی ہے۔ ویڈیو نے فلموں پر کافی اثر ڈالا ہے فلم سازوں کو یہ عام شکایت ہے کہ
ان کی فلمیں ریلیز ہونے سے قبل ہی ویڈیو کے ذریعہ نہ صرف بھارت بلکہ دنیا کے بہت سے دوسرے دیشوں
میں بھی چوری سے پہنچ جاتی ہیں بھارت میں اس طرح کی چوری کو روکنے کے لیے قانون بنائے گئے ہیں
لیکن چوری کا یہ سلسلہ پتہ نہیں کس حد تک جاری ہے مجھے بتایا گیا کہ یہ بیماری پاکستان میں بھی ہے پاکستان
میں فلم سازی کی صنعت کو دو طرح سے بھاری دھکا لگا ہے ایک تو پچھلے دروازے سے بھارتی فلموں کے

ویڈیو کیسیٹ پاکستان میں اکثر دستیاب ہوجاتے ہیں دوسرے پاکستانی ٹیلی ویژن نے یہاں کی فلمی صنعت کو بہت نقصان پہنچایا ہے پاکستان خصوصاً لاہور میں جو ملکی تقسیم سے قبل فلمی صنعت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اب محض گنی چنی پنجابی فلمیں ہی بنتی ہیں اُردو فلمیں مقابلتاً بہت ہی کم بنتی ہیں۔

کھُلے طور پر یہ بات تسلیم کی گئی کہ بھارتی فلمیں عام طور پر معیاری ہوتی ہیں اور یہ پاکستان میں بے حد مقبول ہیں جس دن بھارت میں دُوردرشن پر کوئی فلم دکھائی جاتی ہے تو لوگ پاکستان ٹی۔وی کے اچھے سے اچھا پروگرام دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے اور صرف بھارتی فلم دیکھنے کو ترجیح دیتے ہیں اسی طرح بھارتی فلموں کے گیتوں کے پروگرام چترہار کو بھی بے حد پسند کیا جاتا ہے یقیناً فلم سازی کے میدان میں بھارت کو برتری حاصل ہے

بھارت کے فلمی اداکاروں میں دھرمیندر، موہن کمار اور نئے چہروں میں سنے دت اور راج ببر پاکستان میں بہت مقبول ہیں اداکاراؤں میں ریکھا، ہیما مالنی، سمتا پاٹل، شبانہ اعظمی، مون اور سری دیوی کو کافی پسند کیا جاتا ہے شتروگھن سنہا اور سنجیو کمار کے نام بھی وہاں بہت احترام سے لیے جاتے ہیں۔ پاکستان کے صدر ضیاالحق اور شتروگھن سنہا کی ذاتی دوستی تو کافی مشہور رہے۔ پاکستان میں بھارت کی پُرانی فلمیں بہت دلچسپی سے دیکھی جاتی ہیں۔

پاکستانی ٹیلی ویژن اور بھارتی دُوردرشن

پاکستانی ٹیلی ویژن اور بھارت کے دُوردرشن کے بارے میں بہت کھُل کر اور نہایت تفصیل سے بات چیت ہوئی بہت سے سوالات کے جواب میں مَیں نے کہا کہ پاکستانی ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے ڈرامے بہتر ہوتے ہیں بھارتی پنجاب کے سرحدی اور کچھ دوسرے علاقوں میں پاکستانی ٹی وی کے پروگرام دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایسے ناظرین کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں ہے لیکن پاکستانی ڈراموں کا چرچا بھارت میں اکثر ہوتا رہتا ہے یہ ذکر اخباروں اور رسالوں میں بھی ہوتا ہے پاکستانی ٹی۔وی ڈراموں میں سے مقبول ترین طویل ڈراموں "لاروال، (بشریٰ رحمان) اور" وارث" (امجد اسلام امجد) کے وڈیو کیسیٹ بھارت میں فروخت ہوتے رہے ہیں۔ وہاں کئی دیگر پاکستانی ڈراموں کے کسٹ بھی دستیاب ہیں اشفاق احمد، قدسیہ بانو اور سوبھائی کے ڈرامے بھی بھارت میں نہایت دلچسپی سے دیکھے اور

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... سیریل ... [illegible]

[illegible] دوردرشن کے قومی ... [illegible]

[illegible] ... ان کی ... [illegible]

لوگوں کو ... [illegible] ... ہندی ... [illegible]

استعمال ہندی ... [illegible] ... ہوتے ہیں [illegible]

آسان ... [illegible] ... دوردرشن ہندی کا استعمال کرتا

بھارت کی قومی ... [illegible] ... بعض لوگوں کو یہ شکایت ہے ... پاکستان ٹی وی کے پروگراموں میں

... [illegible] ... پاکستان کی قومی ... ہم دیکھنے والوں کی سمجھ میں آ جاتے ہیں تو پاکستان

میں جو اردو کا استعمال ہوتا ہے وہ بھارت میں ... پاکستانی قوم کے لیے ہوتے ہیں اس لیے دونوں ٹیلیویژنوں

ٹی وی کو پروگرام ... [illegible] ... پاکستان ...

کے حوالے کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے

دوردرشن کے پروگراموں کے بارے میں بھارت کے اخباروں اور رسالوں میں اکثر یہ چرچا ہوتا تھا کہ ہندی اور انگریزی کے ... دوردرشن کے لیے ڈرامے، سیریل یا کوئی ایسے دوسرے پروگرام بنانے کی منظوری کے لیے بڑے بڑے فلم پروڈیوسر، کہانی کار اور ایسے دوسرے لوگ لگاتار چکر لگاتے ہیں اور یہ بات عام کہی جاتی ہے کہ اس سلسلے میں رشوت کا بازار گرم ہے۔ لاکھوں کا لین دین ہوتا ہے اور بڑی بڑی سفارشیں بھی چلتی ہیں۔ دوردرشن کے بارے میں اسی طرح کی خبر پالامور کے بعض اخباروں میں بھی پڑھنے کو ملی جس میں مشہور صحافی، فلم ساز، ادیب اور صحافی جناب خواجہ احمد عباس کا ذکر تھا جس میں بیان کیا گیا تھا

کہ دوردرشن کے اعلیٰ حکام نے خواجہ احمد عباس کے کسی پروجیکٹ کو ان کے بار بار دہلی چکر لگانے کے باوجود اس لیے منظوری نہیں دی کیوں کہ وہ رشوت میں بھاری رقم خرچ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ایسی خبریں بھارتی اخباروں میں بھی شائع ہوئی تھیں یہی سوال آج کی تقریب میں بھی مجھ سے کیا گیا کہا گیا کہ آپ بھی دوردرشن کے لیے ڈرامے اور دیگر پروگرام پیش کرتے ہیں کیا واقعی دوردرشن والے بغیر رشوت کے کسی پراجیکٹ کو منظوری نہیں دیتے؟ میں نے کہا کہ دوردرشن سے درجن بھر میرے ڈرامے دکھائے جاچکے ہیں لیکن ابھی تک میرے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا میں نے بتایا کہ میں کوئی پروفیشنل ڈرامہ نگار یا ڈائریکٹر نہیں ہوں بلکہ لکھنا محض میرا شوق ہے جتنے بھی میرے ڈرامے آج تک دوردرشن پر دکھائے گئے ہیں یہ سب مجھ سے فرمائش پر لکھوائے گئے ہیں۔ یہاں تک منڈی ہاؤس، دہلی کی بات ہے، اُن کے بارے میں میری کوئی معلوماتی نہیں ہے کیوں کہ وہاں جانے کی ابھی تک مجھے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ یہی سوال میں نے پاکستان ٹی وی کے پروگراموں کے بارے میں بھی پوچھا تو کہا گیا کہ کچھ بڑے ناموں کو چھوڑ کر سفارش کے بغیر تو یہاں بھی گاڑی نہیں چلتی۔ جن لوگوں کی پہنچ اور رسوخ ہوتا ہے وہ زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسرے لوگ قطار میں کھڑے بس انتظار کرتے رہ جاتے ہیں پاکستان ٹیلی ویژن ہو یا دوردرشن اور یا کوئی بھی شعبہ ہو، سفارش اور رشوت ہماری کارکردگی پر اثرانداز ہو رہی ہے۔ دن بدن گر رہے ہمارے کام کے معیار کی وجہ بھی سادہ یہی ہے

پاکستانی ٹی وی کے اسٹوڈیو میں غیرملکی نہیں جاسکتے

پاکستانی ٹی وی اور دوردرشن کے بارے میں بعد میں احمد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی اور دوسرے لوگوں سے مزید تفصیل میں باتیں ہوئیں جن کا ذکر میں بعد میں کروں گا اس سلسلے میں ایک بات عرض کردوں کہ پاکستان ٹی وی کے اسٹوڈیو میں کسی بھی غیر ملکی کو جانے کی اجازت نہیں ہے اگر انہیں کسی بھی غیر ملکی کو انٹرویو کرنا ہوتا ہے یا اسے اپنے کسی پروگرام میں شامل کرنا ہو جائے تو ایسے پروگراموں کی ریکارڈنگ باہر ہی کی جاتی ہے پاکستان میں میرے قیام کے دوران بہت سی ادبی تقریبات کو اور مجھے ریکارڈ کیا گیا لیکن پاکستانی ٹیلی ویژن کے اسٹوڈیو دیکھنے اور ان کے کام کاج کا مشاہدہ کرنے کی میری آرزو پوری نہیں ہوسکی اس کے برعکس بھارت میں دوردرشن کی طرف سے کسی بھی غیرملکی کے

لیے ایسی پابندیاں عائد نہیں ہیں پاکستان یا کسی دوسرے ملک سے جب بھی کوئی شخصیت بھارت کے دورے پر آتی ہے تو دور درشن والے اُنھیں اپنے اسٹوڈیو میں لا کر صرف انٹرویو کرتے ہیں بلکہ ــــ میری واقفیت کے مطابق، اُن کی خدمات میں معاوضہ بھی پیش کرتے ہیں آل انڈیا ریڈیو کی بھی یہی پالیسی ہے

آج کی شاندار تقریب میں ایسے بے شمار موضوعات پر بہت ہی کھل کر باتیں ہوئیں اور دونوں دیسوں سے متعلقہ بے شمار باتوں کی واقفیت کا تبادلہ بھی ہوا اس لحاظ سے بھی یہ تقریب میرے لیے بہت اہم تھی۔

عطاء الحق قاسمی کی محبت

شام چھ بجے تقریب ختم ہوئی تو عطاء الحق قاسمی مجھے دوستوں اور مداحوں کے گھیرے سے نکال کر کچھ اس انداز سے اپنے ساتھ لے چلے کہ جیسے اُن کا ارادہ مجھے اغوا کرنے کا ہو۔ میں نے پوچھا کہ کہاں لے جارہے ہو تو کہنے لگے ــــ "کم از کم جہنم میں نہیں ــــ بس چپ چاپ آجاؤ ــــ" اور سچ مچ ہی چپ چاپ میں ساتھ ہو لیا وہ جہنم میں بھی لے جاتے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا کیوں کہ عطاء الحق قاسمی کا ساتھ کسی بھی لحاظ اور کہیں بھی جنت کے مزے سے کم نہ ہوتا چند ہی لمحوں بعد ہماری گاڑی ایک شاندار عمارت کے سامنے رک گئی ہمارے ساتھ ہی جو دوسری گاڑی تھی اُس میں امجد اسلام امجد اور دلدار بھٹی تھے اور گاڑی سے اُتر کر وہ بھی ہمارے ساتھ ہو لیے یہ عمارت 'واپڈا' کے دفتر کی تھی جس کے نیچے یعنی انڈر گراؤنڈ "سیزو" (SAZOO) ریسٹورینٹ تھا ہم چاروں بائیں طرف کے گیٹ سے ہوتے ہوئے نیچے ریسٹورینٹ میں داخل ہوگئے ابھی ہم ایک پُر تکلف دعوت کا مزہ لے کر آئے تھے میں نے سوالیہ نگاہوں سے قاسمی کی طرف دیکھا تو کہنے لگے ــــ "یہ جگہ بڑی پُر سکون ہے کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کریں گے"! گھنٹوں باتیں کرتے کرتے میں تھک گیا تھا لیکن اس کے باوجود قاسمی، امجد اور بھٹی سے باتیں کرنے کی خواہش ابھی بھی زندہ تھی قاسمی اور امجد سے کئی بار ملاقاتیں اور باتیں ہو چکی تھیں لیکن دلدار بھٹی سے میری یہ پہلی ملاقات تھی قاسمی نے دلدار پرویز بھٹی کے بارے میں کافی تفصیل سے مجھے بتایا کہ یہ صاحب ان دنوں ہی کی طرح کالج میں پروفیسر ہیں، شاعر ہیں اور پاکستان ٹی وی کے مقبول ترین سی کا رمیں شاید میں پہلے

بھی دکر کر چکا ہوں کہ لاہور ٹیلی وژن سے ایک پنجابی پروگرام میلہ دکھایا جاتا ہے جسے دلدار بھٹی پیش کرتے ہیں اور اپنے بے ساختہ انداز بیان، اپنی باتوں اور چھوٹے چھوٹے لطیفوں سے حاضرین و ناظرین کو ہر لمحہ ہنسنے اور قہقہے لگانے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں

یہ ریستوریٹ کا ماحول واقعی بے حد پُرسکون تھا۔ وسیع حال کی دیواروں کے رنگوں، اس پر آویزاں بہت خوبصورت تصویروں، فرنیچر اور ماحول میں بڑا ہی سلیقہ تھا اس وقت ہمارے علاوہ صرف تین چار جوڑے اور تھے جو ادھر اُدھر ہال میں موجود تھے۔ ہم نہ ہوتے تو شاید مکمل ویرانی کا سا احساس پیدا ہو جاتا لیکن ہماری موجودگی خصوصاً عطاءالحق قاسمی اور دلدار پرویز بھٹی کی موجودگی نے اس احساس کو بلند قہقہوں میں سمیٹ کر ماحول کو شگفتہ سا بنا دیا تھا باتیں ہوں، اُن میں بے تکلفی ہو، مسکراہٹیں اور قہقہے ہوں، تو باتوں کا مزہ ہی اور ہوتا ہے ـــــ اور باتوں کا یہ بھرپور لطف آج مجھے حاصل ہوا تھا

ریسٹوریٹ سے نکلے تو امجد اسلام امجد اور دلدار پرویز بھٹی اپنی اپنی راہ ہو لیے ـــ عطاءالحق قاسمی سے میں نے گھر چلنے کے لیے کہا لیکن گھومنے کا بھوت بھی ان پر سوار تھا اور آج ایک بار پھر ہم دونوں لاہور کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ آج گھومنے کا انداز دراصل مختلف تھا وہ مجھے لاہور کے چینی اور پاکستانی ہوٹلوں و ریسٹوریٹوں کی سیر کراتے رہے ـــــ یہاں کا سوپ بہت مزیدار ہوتا ہے ـــــ یہاں کی آئس کریم کا جواب نہیں ـــــ وغیرہ وغیرہ نہ جانے کتنی چیزوں کی تعریف کے بہانے وہ کتنی جگہوں پر رُکے اب تو ان جگہوں کا نام بھی مجھے یاد نہیں بس، یاد ہے تو عطاءالحق قاسمی کی محبت، دوستی اور اس کے قہقہے

جب ہم گھر پہنچے تو رات کے دس بج رہے تھے نسترین کھانے پر میری منتظر تھیں لیکن کچھ بھی کھانے کی گنجائش بھی ہی کہاں، نسترین آج کسی سرکاری کانفرنس کے سلسلے میں لاہور سے باہر سفر پر رہی تھیں اور تھکان محسوس کر رہی تھیں۔ دن بھر کی لگاتار مصروفیات اور دوڑ دھوپ کے باعث میں بھی کافی تھک گیا تھا اس لیے آج رات اور زیادہ دیر تک محفل جمانے کی ہمت نہیں تھی۔

ایک مصروف ترین دن

۲۷ فروری کی صبح کو کچھ دوستوں کو فون کیے اور کئی دوستوں کے فون آئے عطاالحق قاسمی نے آج شام اپنے گھر ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا تھا "ادبِ لطیف" کے مدیر اطہر جاوید کا فون تھا کہ انھوں نے بھی ایک ادبی نشست آج بعد دوپہر ہی اپنے دفتر میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے اطہر کو بتایا کہ آج شام عطاالحق قاسمی بھی ایسی ہی ایک تقریب منعقد کر رہے ہیں تو انھوں نے صدیقہ بیگم صاحبہ سے مشورہ کرنے کے بعد کہا کہ بعد دوپہر تین بجے کا وقت رکھ لیتے ہیں وہاں سے سیدھے آپ عطا کے ہاں چلے جائیں۔ ایک فون مقبول احمد دہلوی کا تھا جنھوں نے آگاہ کیا کہ روزنامہ "امروز" کے جناب وحید عثمانی صاحب نے مجھے قبل از دوپہر اپنے دفتر میں مدعو کیا ہے۔ میں نے مقبول دہلوی سے کہا کہ بارہ بجے کا وقت رکھ لیتے ہیں کیونکہ اس سے قبل سے پہلے مجھے بشریٰ رحمٰن کے ساتھ پنجاب صوبائی اسمبلی جانا تھا جہاں ایک سینٹر (senator) کا الیکشن ہونے والا تھا اس کے بعد جناب حمداختر اور مشہور افسانہ نگار جناب انتظار حسین کو ملنے کا پروگرام تھا مشہور غزل گو مہدی حسن سے بھی ملنا تھا۔ انھیں کرس ادیب کا پیغام پہنچانا تھا انھی دنوں مہدی حسن کی غزلوں کی ایک نئی کیسٹ ٹیپ ریلیز ہوئی تھی جس میں شامل تمام غزلیں کرس ادیب کی لکھی ہوئی تھیں۔ اُس نے مجھے وہ کیسیٹ بھی حاصل کرنی تھی فون کیا تو پتہ چلا کہ مہدی حسن ان دنوں لاہور میں نہیں ہیں۔ ان کے ہاں میں نے اپنا پیغام اور فون نمبر چھوڑ دیا اس لیے کہ اگر لاہور میں میرے قیام کے دوران وہ لوٹ آئیں تو رابطہ قائم ہو سکے

دکر حیدڑی گڑھ کا

ساڑھے دس بجے بشریٰ رحمٰن کے ہمراہ میں پنجاب اسمبلی روانہ ہوا راستے میں بشریٰ بھارتی پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے بارے میں پوچھتی رہیں میں نے بتایا کہ یہ چنڈی گڑھ میں واقع ہے جو پنجاب کے علاوہ ہریانہ کی راجدھانی بھی ہے اور دونوں صوبوں کے اجلاس یہیں منعقد ہوتے ہیں انھوں نے پوچھا کہ اجلاس کی تاریخیں اگر ایک ہی ہوں تب یہ اجلاس کیسے ہوتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ دونوں صوبوں کی راجدھانی ایک ہی شہر میں ضرور ہے لیکن دونوں کی اسمبلیاں علیحدہ علیحدہ ہیں

مسٹر نے حیدری گڑھ کے بارے میں سنا تھا، اس شہر کو دیکھنے کی ان کی خواہش تھی میں نے کہا کہ اگلی بار جب بھی آپ بھارت تشریف لائیں تو اپنے پروگرام میں حیدری گڑھ کا دورہ بھی شامل کر لیں۔ اور اگر حالات نارمل ہوں تو بھارتی پنجاب بھی تشریف لائیں۔ وہاں آپ کا پُرتپاک سواگت ہوگا۔ انھوں نے وعدہ کر لیا۔ حیدری گڑھ کے بارے میں میں نے انھیں مزید بتایا کہ یہ ایک نہایت ہی خوبصورت اور نیا تعمیر شدہ شہر ہے۔ اس شہر کو دیکھنے کے بعد آپ کو پاکستان کی راجدھانی اسلام آباد ہونے کا گمان ہوگا۔ حیدری گڑھ میں ایک نہایت ہی خوبصورت 'روز گارڈن' ہے جہاں گلابی، سُرخ، سفید سندوری، سبز، سیاہ اور بے شمار رنگوں کے گلاب ہیں۔ شاید دنیا میں اسی قسم کا یہ گلابوں کا واحد باغ ہے۔ اسی شہر میں ایک خوبصورت مصنوعی جھیل ہے اور یہیں عالمی شہرت یافتہ پتھروں کا باغ یعنی راک گارڈن بھی ہے۔ اس کی مکمل تعمیر نیک چند نامی ایک ہی آدمی نے کی ہے۔ اس کی تعمیر میں پتھر کے ٹکڑوں، پھٹے پرانے کپڑوں، رنگ برنگے شیشے کے ٹکڑوں اور ایسی بہت سی فالتو قسم کی چیزوں کا استعمال کیا گیا ہے اس میں پنجاب کی زندگی کی مکمل جھلک نمایاں ہے

پاکستانی پنجاب کی صوبائی اسمبلی

باتوں باتوں میں ہم صوبائی اسمبلی کی عمارت کے سامنے پہنچ گئے تھے مجھے دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ یہ عمارت عین بازار میں واقع ہے اور اس کے تینوں طرف بڑے بڑے شوروم، دفاتر وغیرہ کی اونچی اونچی عمارتیں ہیں یہ تمام بلڈنگیں شاید آزادی کے بعد تعمیر ہوئی ہوں گی۔ انگریز کے زمانے میں بھی پنجاب اسمبلی کی یہی بلڈنگ تھی جس میں آزادی کی لڑائی لڑ رہے ہندوستانیوں کے خلاف انگریز کے ظلم و ستم کی کہانیوں نے جنم لیا تھا اور اسی میں شہیدِ اعظم سردار بھگت سنگھ جیسے سورماؤں کی ولولہ خیزیاں ناچی تھیں میں نے اپنی عمر کے ہوش میں وہ دور دیکھا تو نہیں لیکن اس دور کی کہانیاں سُنی ہیں ——— اور ان میں سے بے شمار کہانیوں سے منسلک پنجاب اسمبلی کی یہ عمارت میری آنکھوں کے سامنے تھی۔

پاکستانی وفاقی کونسل کے لیے ایک نشست کے الیکشن کے سلسلے میں صوبائی اسمبلی کے اراکین اور ان کے حمایتیوں کا زبردست اجتماع تھا۔ ایک صحافی نے بتایا کہ یہاں بھی سیاسی توڑ پھوڑ، بار بار اور خرید و فروخت ہوتی ہے۔ ممبری حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کے سیاسی حربے استعمال ہوتے ہیں

میں نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا اور دل ہی دل میں سوچا کہ تمام سیاسی چہرے لگ بھگ ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکا اور ادب کی دنیا کے دوستوں سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

روزنامہ "امروز" کے لیے انٹرویو

مال روڈ پر واقع مقبول دہلوی کے دفتر سے انھیں ساتھ لے کر سب سے پہلے میں رنگ محل پہنچا جہاں مشہور ادیب جناب حمید اختر کا دفتر ہے لیکن حمید اختر کہیں گئے ہوئے تھے اور ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ جناب انتظار حسین کے دفتر گئے تو وہ بھی نہیں ملے۔ ان سے گذشتہ دنوں دو بار محض دعا سلام جتنی ملاقات ہوئی تھی باقاعدہ ملاقات ابھی تک نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اردو کے ایک ممتاز ادیب ہیں اور علامتی افسانے کی دنیا کا بہت بڑا نام۔ میں علامتی اور تجریدی افسانے نہیں لکھتا، اس کا حامی بھی نہیں ہوں لیکن اس کے باوجود انتظار حسین صاحب سے ملنے کی شدید آرزو تھی۔ ایک اعلیٰ افسانہ نگار کے علاوہ وہ ایک سیدھا اور سیدھا سادہ شخصیت کے مالک ہیں۔ جناب حمید اختر اور انتظار حسین سے ملاقات نہ ہو سکنے کے باعث ہم روزنامہ امروز کے دفتر میں وقت سے کچھ پہلے ہی جناب وحید عثمانی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ان سے ملاقات ہوئی، رسمی باتیں ہوئیں اور چائے سے لطف اندوز ہوئے۔ عثمانی صاحب دکن (بھارت) کے رہنے والے ہیں۔ وہ ماضی کی یادوں میں کھوئے اپنے ماضی کی باتیں کرتے رہے، اپنے گھر پریوار کی باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ ملکی تقسیم نے ان کے خاندان کو بھی تقسیم کر دیا۔ کچھ افراد پاکستان آکر بس گئے، کچھ بھارت میں ہی رہ گئے اور کچھ بعض دوسرے ممالک میں رہائش پذیر ہو گئے۔ اس تقسیم کا درد وہ آج بھی محسوس کر رہے تھے۔

رسمی باتوں کے بعد وحید عثمانی مجھے انٹرویو کرنے لگے۔ بالکل میرے جنم سے لے کر اب تک کی میری زندگی کی مکمل کہانی انھوں نے مختلف سوالات کے ذریعہ قلم بند کر لی۔ یہ سلسلہ لگ بھگ ایک گھنٹہ جاری رہا۔ اس کے بعد وہ ہمیں "امروز" کے چیف ایڈیٹر کے کمرے میں لے گئے اور ان سے زبان، ادب اور صحافت کے موضوعات پر کافی دلچسپ باتیں ہوئیں۔ ہم نے "امروز" کا دفتر بھی دیکھا۔ اسی ادارے سے ایک انگریزی روزنامہ بھی شائع ہوتا ہے۔ امروز بہت پرانا اردو روزنامہ ہے۔ غالباً فیض احمد فیض اس اخبار کے پہلے ایڈیٹر تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ کسی زمانے میں سب سے زیادہ چھپنے والا

اخبار تھا لیکن اب روزنامہ "مشرق" اور "نوائے وقت" کے بعد کی صف کے اخباروں میں شمار ہوتا ہے۔
لیکن آج بھی اس کی اشاعت کافی زیادہ ہے۔ اس اخبار کے دفاتر کی بلڈنگ اور مشینری پرانی ہے لیکن
اخبار کی طباعت جدید طرز پر ہوتی ہے۔

اخبار "امروز" کے دفتر سے نکلے تو وحید عثمانی بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ اردو بازار میں کئی ناشروں
سے انھوں نے ہماری ملاقات کرائی اور پھر سردار محمود کے دفتر میں ایک بار پھر گلابی چائے کا لطف حاصل
کیا۔ وحید عثمانی وہیں رہ گئے اور ہم "تخلیق" کے دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں صدیقہ بیگم اور اطہر جاوید
نے ایک نشست کا اہتمام کر رکھا تھا۔

ماہنامہ ادبِ لطیف کے دفتر میں

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ ماہنامہ "تخلیق" اور ماہنامہ "ادبِ لطیف" دونوں رسالے یہیں سے
شائع ہوتے ہیں اور دونوں کی مدیرہ محترمہ صدیقہ بیگم ہیں۔ اطہر جاوید بھی بطور مدیر ان دونوں پرچوں
سے وابستہ ہیں جب ہم دفتر میں داخل ہوئے تو صدیقہ بیگم، اطہر جاوید اور ان کے اسٹاف کے علاوہ
کئی دوسرے حضرات بھی وہاں موجود تھے ان میں صحافی، قلم کار اور دوست احباب شامل تھے ان سب
سے جو باتیں ہوئیں، یہ لگ بھگ وہی تھیں جو گذشتہ کئی دنوں سے پاکستان میں دوستوں سے
ہوتی رہی تھیں۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ صدیقہ بیگم اور اطہر جاوید نے بیاہ محبتوں سے مجھے نوازا تھا اور
حد سے زیادہ عزت اور احترام عطا کیا تھا اسی محفل میں ایک لڑکی عرا بھی تھی جو سائد محکمہ تعلقات عامہ
پنجاب میں انفارمیشن آفیسر تھی۔ مجھے وہ بہت پیاری، گڑیا جیسی لگی تھی اس کی باتوں میں پیار، سلیقہ، شائستگی
اور شوخی سبھی کچھ تھا۔ میرے لیے کشش کی سب سے بڑی وجہ اس کی بے باک گفتگو کا انداز تھا جو مری مٹی
بھارتی سے بالکل ملتا جلتا تھا۔ عرا کا جنم پاکستان ہی میں ہوا تھا لیکن اس کے خاندان کا تعلق لدھیانہ
سے تھا۔ اسے جب علم ہوا کہ میں لدھیانہ سے آیا ہوں تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔ اپنے بزرگوں
سے سنی باتوں کے سہارے عرا لدھیانہ کی باتیں کرتی رہی۔ اسلام گنج، ملاڈ گنج اور کئی دوسرے علاقوں
کا ذکر کرتی رہی جو آج بھی لدھیانہ میں انھیں ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ ان علاقوں سے اس کے بزرگوں
کا کوئی نہ کوئی تعلق رہا ہوگا۔ بھارت اور خاص طور سے لدھیانہ آنے اور اس شہر کو دیکھنے کی اس کی

شدید خواہش تھی۔ اکثر میں سوچتا ہوں کہ انسان کے من کی یہ چھوٹی چھوٹی خواہشیں اسے خوشی اور غم سے ہم کنار کرتی ہیں۔ خواہش پوری ہو جائے تو خوشی کا احساس جنم لیتا ہے۔ خواہش پوری نہ ہو تو ایک کسک سی پیدا ہوتی ہے۔ یہ خوشی، غم اور ان کا احساس ہی شاید انسانی زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔

"ماہِ نو" کے مدیر قائم نقوی

باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ شام چار بجے کے قریب جناب قائم نقوی تشریف لے آئے۔ عطاء الحق قاسمی نے یہ ذمہ داری قائم نقوی پر ڈالی تھی کہ وہ مجھے "تخلیق" کے دفتر سے سیدھے اُن کے گھر لے جائیں جہاں میرے اعزاز میں انھوں نے ایک تقریب منعقد کر رکھی تھی۔ صدیقہ بیگم، اظہر جاوید، غزالہ اور دوسرے تمام لوگوں نے بڑی محبت سے مجھے رخصت کیا اور میں عطاء الحق قاسمی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مقبول دہلوی اور قائم نقوی میرے ساتھ تھے۔

قائم نقوی ماہنامہ "ماہِ نو" کے مدیر ہیں۔ یہ ایک نہایت خوب صورت اور ادبی رسالہ ہے جو پنجاب سرکار کی طرف سے شائع کیا جاتا ہے۔ قائم نقوی میرے لیے "ماہِ نو" کے کئی خصوصی شمارے اپنے ساتھ لائے تھے جو انھوں نے بڑی محبت کے ساتھ بطور تحفہ مجھے پیش کیے۔ گاڑی میں ان سے بات چیت کرنے کا موقع بھی ملا۔ مقبول دہلوی نے بتایا کہ قائم نقوی بہت اچھے افسانہ نگار بھی ہیں اور نوجوان نسل کے نمائندہ قلم کاروں کی پہلی صف میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

دعوت عطاء الحق قاسمی کی رہائش گاہ پر

عطاء الحق قاسمی کی رہائش گاہ علامہ اقبال ٹاؤن میں ہے۔ اس کالونی میں لاہور کے بہت سے دوسرے ادیب، شاعر اور صحافی بھی رہائش پذیر ہیں۔ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد علم ہوا کہ عطاء الحق قاسمی نے آج کی اس ادبی تقریب میں بے شمار ادبی شخصیتوں کو مدعو کر رکھا ہے جن میں سے بیشتر حضرات تشریف لا چکے تھے۔ اس تقریب کی صدارت جناب احمد ندیم قاسمی نے کی۔ یہاں کے مشہور شاعر جناب فخر زماں اور جناب حسن رضوی کچھ تاخیر سے تشریف لائے۔ میزبان عطاء الحق قاسمی کے

علاوہ ڈاکٹر سلیم اختر، احمد سیار، حالا احمد مقبول دہلوی، حبیب احمد، زاہد مسعود، قائم نقوی اور
بہت سے دوسرے اہلِ قلم تقریب میں شامل تھے لاہور میں میرے قیام کے دوران اس تک
کی ادبی نشستیں منعقد ہو چکی تھیں اکثر ادبی تقریب میں میں اپنے افسانے پڑھ چکا تھا آج بھی
یہی فرمائش ہوئی تو میں نے کہا کہ آج افسانہ نہیں، باتیں ہوں گی میں کئی افسانے پڑھ چکا ہوں
اور پھر میرے افسانے یہاں کے متعدد رسالوں میں چھپتے ہی رہتے ہیں اور جنہیں آپ لوگ پڑھتے بھی
ہیں میری بات مان لی گئی اور ہم سب باتوں میں مشغول ہو گئے۔

احمد ندیم قاسمی سے تفصیلی ملاقات

جناب احمد ندیم قاسمی سے اب تک کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں لیکن تفصیل سے بات چیت کرنے کا
موقع نہیں ملا تھا اُن سے مفصل اور ایک بھرپور ملاقات کی خواہش تھی جو آج پوری ہو گئی احمد ندیم قاسمی
اُردو ادب کا ایک ستون ہیں اور ادب کے ہر شعبے میں اُن کی ایک الگ پہچان ہے لیکن افسانہ نگار میں اُن
کے طاقتور قلم کا خاص طور سے مداح ہوں میں خود بھی افسانہ نگار ہوں اس لئے قدرتی طور پر افسانے
کے موضوع پر اُن سے زیادہ باتیں ہوئیں۔

دورانِ گفتگو قاسمی صاحب نے کہہ دیا ——— "آپ پرسوں دن بھر ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ
رہے" میں نے ہاں میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ لگاتار بارہ گھنٹے ان سے باتیں ہوئیں انور سدید
اور شہزاد احمد بھی چند گھنٹے ساتھ رہے۔ اور ساتھ ہی میں نے پوچھ لیا کہ یہ سراغ آپ کو کس نے دیا قاسمی
صاحب مسکرا دیئے دراصل پاکستان کی ادبی دنیا کے دو بڑے محاذ ہیں ایک کی قیادت احمد ندیم قاسمی
کر رہے ہیں اور دوسرے کی ڈاکٹر وزیر آغا اپنے قیام پاکستان کے سلسلے میں میری بہت سے ادیبوں
سے بات چیت ہو چکی تھی اور میں اس حقیقت سے بخوبی واقف ہو چکا تھا کہ دونوں محاذ بے حد گرم
ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے پاس رسالہ "فنون" ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا کے پاس رسالہ "اوراق" اسی
طرح بعض چھوٹے بڑے رسالے اور اخبارات بھی دو حصوں میں تقسیم ہو کر دونوں محاذوں پر ڈٹے ہوئے
ہیں یہی حالت بہت سے قلم کاروں کی ہے جو ان دونوں میں سے کسی نہ کسی سے وابستہ ہیں اور ان
دونوں ادبی گروہوں میں مسلسل سرد جنگ جاری ہے اس موضوع پر اپنی طرف سے میں نے تو ڈاکٹر

در پر آ جانے کوئی بات کی تھی اور نہ ہی احمد ندیم قاسمی سے کیوں کہ میرے دل میں دونوں کی ادبی شخصیت
کا بے حد احترام ہے اب جب کہ قاسمی صاحب نے خود ہی بات چھیڑ لی تھی تو میں نے بلا جھجک پوچھ لیا کہ آپ
دونوں ایک دوسرے سے خفا کیوں ہیں؟ قاسمی صاحب بس اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے کہ چند سال
قبل فنون میں چھپا ایک مضمون ڈاکٹر وزیر آغا کو پسند نہیں آیا اور بات وہیں سے بڑھ کر طول پکڑ گئی
میں نے کہا کہ اس طرح کی ادبی محاذ آرائی سے ادیب اور ادب دونوں ہی کو نقصان پہنچ سکتا ہے ادب
میں تعمیری کام نہیں ہوتا ادبی نقطۂ نظر سے اس طرح کی گروہ بندی ادبی رفتار پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔
وغیرہ وغیرہ۔ اس سے قبل کہ قاسمی صاحب کوئی جواب دیتے ایک صاحب نے میری بات ٹوکتے ہوئے کہا کہ
ادبی محاذ گرم رہیں تو حرکت رہتی ہے ورنہ حرکت بند ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس چست فقرے
پر سبھی ہنس دیے اور اس کے ساتھ ہی یہ موضوع بھی بدل گیا

عالمی پنجابی کانفرنس کا ذکر

اسی دوران حسن رضوی اور فخر زماں صاحب تشریف لے آئے حسن رضوی سے کئی بار ملاقات اور
بات چیت ہو چکی تھی فخر زماں صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی مجھے بتایا گیا کہ فخر زماں صاحب عنقریب
لاہور میں عالمی پنجابی کانفرنس منعقد کرنے والے ہیں اس کا ذکر میں نے بھارت میں بھی سنا تھا
لدھیانہ سے روانگی کے وقت میرے دوست کرشن ادیب، عمانٹ چیتر کار، ڈاکٹر رحان اکبر راہی اور بہت
سے دوسرے پنجابی قلم کاروں نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں لاہور میں فخر زماں سے مل کر عالمی پنجابی کانفرنس کے
بارے میں پتہ کروں یہ تمام لوگ کانفرنس میں شرکت کے خواہاں تھے میں نے اس کا ذکر جناب فخر زماں سے
کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے وعدہ کیا کہ کانفرنس کی قطعی تاریخ طے ہوتے ہی وہ مجھے مطلع
کریں گے اور ان تمام قلم کاروں کو شرکت کے لیے دعوت نامے ارسال کریں گے جو تر کانفرنس کے
مختلف پہلوؤں پر انھوں نے مجھ سے بہت تفصیل سے بات چیت بھی کی اس ضمن میں بھارتی پنجاب
میں تخلیق ہو رہے پنجابی ادب اور پاکستان کے پنجابی ادب کے مختلف مسائل پر بھی
گفتگو ہوئی۔
پاکستان کے نوجوان شاعر خالد احمد بہت دلچسپ انسان ہیں محفل میں ان کے چپ

معترے اور عطاء الحق قاسمی کے ملے تقریباً برابر گو کتے رہے۔ سب سے کم بولنے والوں میں سب علاوہ احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سلیم اختر اور عالم نقوی تھے جو شاید محفل کی تنوعیوں سے سب سے زیادہ لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بات جیت کا دور لمبا ہو گیا تو عطاء الحق قاسمی نے اسٹرول کا اعلان کرتے ہوئے سب کو چائے کے لیے مدعو کیا چائے تو محض نام کو تھی، عطاء الحق لاہور بھر کے لوازمات اٹھا لائے تھے اور ہر کسی کو بڑے پیار سے کہہ رہے تھے ——— "بھئی، یہ کھاؤ ——— اس کا مزا تو دیکھو ———" اور کوئی ان کے پیار پر انکار کرنے کی ہمت کر بیٹھتا تو وہ بلا تکلف ہو کر دھمکیوں پر اتر آتے انجام کا اندازہ آپ خود ہی لگا لیجیے

چائے کا دور ختم ہوا تو محفل مشاعرے میں بدل گئی شاید مسرے اور مقبول دہلوی کے علاوہ یہاں موجود ہر ادیب شاعر بھی تھا اس لیے ان کا خوب صورت کلام سننے کا موقع بھی مل گیا شعر و شاعری کے دور کے بعد آج کی باقاعدہ محفل اپنے اختتام کو پہنچی ہاتھ ملاتے ہوئے اور بغل گیر ہوتے ہوئے دوست ایک ایک کرکے چلے گئے گھر میں گھر کے مالک عطاء الحق قاسمی کے علاوہ میں، مقبول دہلوی اور ڈاکٹر سلیم اختر رہ گئے

مشہور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر اردو کے مشہور نقاد، محقق، ادیب ہونے کے علاوہ ماہر نفسیات بھی ہیں اور جنسی نفسیات کے موضوع پر ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ میرے قلم کا موضوع بھی ہے اس لیے ہم دونوں اس موضوع پر بات چیت میں مصروف ہو گئے اس دوران عطاء الحق قاسمی نے ٹیلی ویژن کا سوئچ آن کر دیا اس وقت بچوں کے لیے سیریل "علی بابا چالیس چور" دکھایا جا رہا تھا یہ سیریل عطا الحق قاسمی کا لکھا ہوا تھا جسے ہم نے بہت دلچسپی سے دیکھا پروگرام ختم ہوا تو ہم پاکستان کے ٹی۔ وی پروگراموں کے بارے میں باتیں کرنے لگے دریافت کرنے پر عطاء الحق قاسمی نے مجھے بتایا کہ پاکستان میں جو شاعر اور قلم کار مشاعروں اور ادبی پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں انھیں فی منٹ کے حساب سے معاوضہ دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مباحثہ یا مشاعرے میں حصہ لینے والے کو اسے منٹوں کے عوض معاوضہ دیا جاتا ہے جتنے منٹ اس نے اپنی غزل، نظم یا بات چیت کی کمپیئر کو مطابق زیادہ یعنی اس پروگرام کے کل

وقت کا معاوضہ ملتا ہے۔ میں نے بتایا کہ بھارت میں دوردرشن پر معاوضے کی ادائیگی کا ایسا کوئی سسٹم نہیں ہے جس سے ہم نے حساب کتاب لگایا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ پاکستانی ٹی۔وی پروگرام پیش کرنے پر فنکار کو دوردرشن کے مقابلے میں کافی زیادہ معاوضہ پیش کرتا ہے کیمرے کا رول زیادہ اہم ہوتا ہے اس کا احساس پاکستانی ٹی وی والوں کو ہے، دوردرشن والوں کو نہیں

پاکستان ٹیلی ویژن اپنے ڈراموں اور طویل سیریل کے لیے کافی مشہور رہے۔ ان ڈراموں اور سیریل کی بدولت ہی، صرف پاکستانی فلموں کا کاروبار ٹھپ ہوگیا ہے بلکہ بہت سے فلمی اداکار بھی فلموں کو چھوڑ کر ٹی۔وی ڈراموں میں حصہ لینے لگے ہیں اس کے علاوہ بہت سے فنکاروں نے ٹی۔وی کے ذریعہ ہی بہت نام کمایا ہے اور دولت بھی دوردرشن کے مقابلے میں پاکستان ٹی۔وی اپنے فنکاروں کو کافی بہتر معاوضہ ادا کر رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب پاکستان ٹیلی ویژن پر ہفتے میں دو بار دیر رات کو فلمیں دکھائی جاتی تھیں ایک عرصے سے اب فلموں کی جگہ طویل ڈراموں نے لے لی ہے اور فلمیں دکھانے کا سلسلہ بند کیا جا چکا ہے وہاں ڈرامہ عموماً پچاس منٹ کا ہوتا ہے اور سیریل کی ایک قسط بھی اتنے ہی وقت کی ہوتی ہے

پاکستان ٹی وی کے ڈرامے

پاکستان ٹی وی پر عمدہ و معیاری ڈرامے کس طرح پیش کر رہا ہے یہ اندازہ مجھے تب ہوا جب عطاء الحق قاسمی نے ڈرامے کی تیاری سے لے کر اس کی ٹیلی کاسٹ تک کے مراحل کی تفصیل بتائی انہوں نے بتایا کہ پروڈیوسر جب کوئی پراجیکٹ ہاتھ میں لیتا ہے تو سب سے پہلے کہانی کا انتخاب کیا جاتا ہے اور پھر کہانی کار سے اس کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت ہوتی ہے کہانی کا انتخاب ہو جانے کے بعد اس کا اسکرین پلے تیار کیا جاتا ہے اور پھر ڈائیلاگ لکھوائے جاتے ہیں یہ مرحلے ہو جانے کے بعد فنکاروں کا انتخاب ہوتا ہے باقاعدہ ریہرسل ہوتی ہے اور پھر اس کی ایک پائیلٹ قسط تیار کی جاتی ہے پاکستان کے مختلف ٹی وی اسٹیشنوں کے ڈائریکٹر اور چند دیگر ماہرین کے علاوہ سرکاری اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی اسے دیکھتی ہے اور اگر یہ قسط پاس ہو جاتی ہے تو سیریل کی باقاعدہ قسطیں بنانے کی اجازت دے دی جاتی ہے آئندہ بھی ہر قسط کو ماہرین باقاعدہ دیکھتے ہیں ہر پراجیکٹ ایک مکمل ٹیم ورک ہوتا ہے جس میں

کہانی کار کو شروع سے کر آخر تک دخل حاصل ہوتا ہے۔ کہانی کار جب کہانی لکھتا ہے تو اس کے ذہن میں ہر کردار احساس بن کر جنم لیتا ہے یہی احساس ایک کامیاب کہانی یا ڈرامے کی ضمانت ہوتا ہے جب تک سیریل ملایا جاتا ہے تب تک پروڈیوسر، ڈائریکٹر، کہانی کار اور ٹیم کے دیگر ذمہ داراراکین میں رابطہ تال میل قائم رہتا ہے ٹیم کا ہر ممبر صرف محنت کرتا ہے بلکہ بہات لگن اور ایمان داری سے کام بھی کرتا ہے۔ بھارت میں جو ڈرامے دُوردرشن کی طرف سے تیار کیے جاتے ہیں، عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ان کا پروڈیوسر خود ہی ڈائریکٹر، کہانی کار، سکرین پلے اور ڈائیلاگ رائٹر ہوتا ہے اس کا بس چلے تو ہر کری کردار بھی وہ خود ہی ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے میں اس کی پیش کش کا معیار کیا ہوگا، اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے ہمارے ہاں بعض حالتوں میں تو پروڈیوسر ڈائریکٹر کو ادب یا کہانی کے فنی پہلوؤں کی درا بھی واقفیت نہیں ہوتی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت بار ناتجربہ کار لوگوں کو ڈرامہ پروڈیوس کرنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ اتنی خامیوں کی موجودگی میں اچھے اور معیاری ڈرامے کی امید ہی نہیں کی جاسکتی۔

ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ پاکستان ٹی۔وی کے لیے تیار کیے جانے والے ڈرامے اور سیریل عموماً ٹیلی ویژن پروڈیوسر ڈائریکٹر ہی تیار کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں قومی پروگرام کے تحت پیش کیے جانے والے تمام ڈرامے اور سیریل ماہر کے لوگ تیار کرتے ہیں

پاکستان میں ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے باقی پروگرام بھی جس پروڈیوسر کے پاس ہوتے ہیں وہ متعلقہ شعبے اور موضوع پر مکمل مہارت رکھتے ہیں مثال کے طور پر ایک ادبی پروگرام پیش کرنے والا پروڈیوسر ادب کے شعبے میں متعلقہ جانکاری رکھتا ہے۔ اسلام یا تعلیم کے کسی موضوع پر پروگرام پیش کرنے والے پروڈیوسر کو اس موضوع پر عبور حاصل ہوتا ہے اکثر حالتوں میں ہمارے ہاں حالات اس کے برعکس ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جالندھر دُوردرشن پر اُردو کا ادبی پروگرام "کارواں" ایک مرتبہ ایک ایسے پروڈیوسر کے سپرد تھا جسے اُردو زبان تک نہیں آتی تھی۔ اسی طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ان حالات میں ہم دُوردرشن سے بہتر اور معیاری پروگراموں کی بھلا کیا امید کر سکتے ہیں۔

بات چیت کا یہ طویل سلسلہ ختم ہوا تو عطاء الحق قاسمی مجھے اپنے مطالعے کے کمرے (اسٹڈی روم) میں لے گئے ان کی شاندار ذاتی لائبریری دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ مختلف رسالوں میں شعری اور نثری

ادب کی ایک بڑی تعداد ان کی لائبریری میں موجود ہے۔ انھوں نے مجھے اپنی کتابیں اور "معاصر" کا تازہ
شمارہ بھی پیش کیا جس کے وہ خود مدیر ہیں۔

ادیب خوش حال ہو رہے ہیں

پاکستان میں زیادہ تر ادیبوں اور شاعروں کو میں نے خوش حال دیکھا اس کے مقابلے میں بھارتی
ادیب زیادہ خوش حال نہیں ہیں۔ میرے ذہن میں یہ سوال کئی بار پیدا ہوا تھا اور آخر عطاء الحق قاسمی
سے میں نے پوچھ ہی لیا کہ اس خوش حالی کی وجہ کیا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ پاکستان کے تمام ادیب اور
شاعر تو اتنے خوش حال نہیں ہیں لیکن ان میں سے اکثر بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔ کافی بڑی تعداد میں
یہاں کے ادیب کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں سے وابستہ ہیں اور بہت سے لوگ بڑے بڑے
اداروں میں ملازم ہیں۔ ان لوگوں کی تنخواہیں بھی معقول ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے بیشتر ادیب کسی نہ
کسی اخبار، ڈائجسٹ، رسالے وغیرہ سے وابستہ ہیں۔ بعض مختلف اخبارات میں باقاعدہ کالم نگار ہیں
اور اس طرح انھیں ان ذرائع سے واجب آمدنی ہو جاتی ہے۔ پاکستان کے بیشتر شاعروں کو غیر ممالک
خصوصاً عرب ممالک اور برطانیہ وغیرہ میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کا موقع ملتا رہتا ہے
اور ایسے غیر ملکی مشاعرے ان کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ لاہور میں ایسے
ادیبوں اور شاعروں کی تعداد کافی بڑی ہے جن کے پاس اپنی گاڑیاں ہیں۔ ہم بھارتی ادیبوں کے مقابلے
میں ان کا معیارِ زندگی بھی بہتر ہے۔

مجھے خوشی کا احساس ہوا کہ ادیب خوش حال ہو رہے ہیں۔ مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی
سے ایک بار میں نے پوچھا تھا کہ جب سے آپ فلمی زندگی میں داخل ہوئے ہیں آپ کا قلم سست پڑتا جا رہا ہے
یعنی آپ نے ادب تخلیق کرنا تو بند کر دیا ہے اور یا بہت ہی کم کر دیا ہے۔ میرے اس سوال کے جواب میں انھوں
نے کہا تھا کہ خالی پیٹ کوئی بھی قلم کار آج کے دور میں بہتر ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ پہلے وقتوں کی بات
اور تھی۔ اب جب کہ مجھے فلمی دنیا میں کامیابی اور دولت میسر ہوئی ہے تو میں مستقبل کے لیے ذرائعِ زندگی
کا سامان پیدا کر لوں۔ ادب تخلیق کرنے کے لیے ساری عمر پڑی ہے ـــــ یعنی آج کے دور میں ہر ادیب
کے لیے خوش حال ہونا لازمی ہے تاکہ اس سے بہتر تخلیقی ادب کی امید رکھی جا سکے۔

اسی موضوع پہ نقوش کے مدیر طفیل صاحب اور جناب قتیل شفائی سے بھی لاہور میں میری بات چیت ہوئی تھی جس کا تعلق صرف اُن کی ذات سے تھا آج اُردو ادب میں دونوں ہی بہت بڑے مسلم ہیں اور ان کا ادبی ہالہ اعتبار سے کافی بڑھ رہا ہے ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی ایسے ماضی میں تالی رشتہ داروں کا سہارا کیا تھا لیکن آج یہ لوگ خوش حال ہیں اور ان کا قلم پوری رفتار سے ادب تخلیق کر رہا ہے میرے خیال میں ادیب کی خوش حالی سماجی اور سرکاری ذمہ داری ہونی چاہیے تاکہ صحت مند تخلیقی عمل جاری رہ سکے۔

سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی

عطاء الحق قاسمی سے اجازت لے کر جب گھر لوٹا تو شب کے ساڑھے نو بج رہے تھے کئی دنوں سے باہر کی ادبی مصروفیات میں اس قدر گھرا رہا تھا کہ گھر پر کھانا کھانے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ نسترین نے گلہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ شاید ہمارا کھانا آپ کو اچھا نہیں لگتا، اسی لیے تو روز ہی باہر سے کھا کر آتے ہو۔ آج انھوں نے خالص پنجابی کھانا یعنی سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی تیار کرایا تھا اور کھانے کے لیے وہ میری منتظر تھیں سچی بات تو یہ ہے کہ کھانے کی گنجائش آج بھی نہیں تھی لیکن نسترین رحمٰن کا گلہ اور بہت ہی پیار سے مایا گیا خالص پنجابی کھانا میری خاموش مجبوری تھی اور میں کھانے کی میز پر نسترین کے ساتھ ہو لیا تھا۔ کھانا واقعی بے حد لذیذ تھا اور کھانے کے بعد پتہ چلا کہ نوکر آج چھٹی پر تھا اور کھانا نسترین نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا

نسترین رحمٰن سے آج کی ہماری بات چیت کا موضوع بالکل گھریلو قسم کا تھا۔ میں نے پوچھا کہ ایسی حالت میں جب کہ آپ بے حد مصروف ہیں اور گھر کے کام کاج کے لیے نوکروں پر منحصر ہیں، نوکر اچانک چھٹی پر چلا جائے تو آپ کو پریشانی ہوتی ہوگی مسکان، جو نسترین کے چہرے پر ہمیشہ ہی سجتی ہے اس وقت کھل اٹھی تھی اور انھوں نے کہا کہ اچانک نوکر کے چلے جانے سے ظاہر ہے کہ پریشانی ہوتی ہے لیکن نوکر بھی انسان ہیں اُن کی بھی بعض مجبوریاں ہو سکتی ہیں ان حالات میں مجھے گھر کا کام کاج دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے بہت سے گھریلو کام اپنے ہاتھوں کرنے میں خوشی کا احساس بھی ہوتا ہے عورت کو گھر کے ہر کام میں مہارت حاصل ہونی چاہیے۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا سکھ ہے میرے سامنے نسترین رحمٰن کا ایک پیارا روپ تھا

ہاتھ حمید اختر کی

۲۸ جنوری کی صبح کو ہی میں نے جناب حمید اختر کو فون کیا اور طے پایا کہ قبل از دوپہر میں اُن سے ملنے ان کے دفتر چلا آؤں ابھی تک ان سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ جناب انور سدید، ڈاکٹر آغا سہیل، فرحدہ لودھی اور سائرہ ہاشمی سے بھی فون پر گفتگو ہوئی ان تمام لوگوں کی محبت کی تپش ہر دل اور ہر لمحہ میرے احساس میں شامل رہی تھی

دوپہر سے قبل میری کوئی معروفیت نہیں تھی نسرین رمل سے میں نے کچھ شاپنگ کرنے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے اپنے دفتر طاہرہ سعدہ کو فون پر تاکید کر دی کہ شاپنگ میں مدد کرنے کے لیے وہ مجھے لاہور کے بازاروں کی سیر کرا دیں۔ نسرین کی گاڑی مجھے دفتر چھوڑ آئی اور میں نے طاہرہ کے ساتھ جا کر ضروری شاپنگ کی بھارت میں چند دوستوں کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں تھیں اور میری کوشش تھی کہ ایک ہر فرمائش کو پورا کر سکوں۔ سب سے بڑی فرمائش پاکستانی غزلوں کے کیسٹوں کی تھی۔ کئی کیسٹ نسرین رمل نے اپنی پسند کے مطابق پہلے ہی منگوا لیے تھے میں نے جناب تقی تمنائی کے بیٹے تو مد تقی سے بھی کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنی پسند کے کچھ کیسٹ میرے لیے خرید لائیں آج جب شاپنگ کے لیے نکلے تو میں نے مہدی حسن، ناہید اختر، غلام علی، منی بیگم اور عابدہ پروین کی غزلوں کے نئے کیسٹ حاصل کرنے کی کوشش کی میرے دوستوں نے بطور خاص ان کی فرمائش کی تھی لیکن مجھے حیرانی ہوئی کہ بڑی بڑی دوکانوں پر بھی ان گلوکاروں کی نئی ریلیز ہوئی کوئی کیسٹ مجھے نہ مل سکی جہاں بھی میں نے غزلوں کے کیسٹ کی مانگ کی تو مجھے پرانی ہندوستانی فلموں کی غزلوں کے کیسٹ پیش کیے گئے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ آج کل ہندوستانی غزلوں کی بے حد مانگ ہے۔ فلمی غزلوں کے علاوہ پنکج اودھاس، جگجیت چترا اور انوپ جلوٹہ کی غزلوں کے کیسٹ بھی مارکیٹ میں آ گئے ہیں جنھیں نوجوان پاکستانی گلوکاروں نے اپنی آواز میں گایا ہے۔ میں نے فخر محسوس کیا کہ غزلوں کے دیس میں میرے وطن کی آوازیں گونج رہی ہیں

شاپنگ سے فارغ ہو کر میں نے طاہرہ کو دفتر چھوڑا اور راستے میں مقبول دہلوی کے دفتر سے انھیں ساتھ لے کر حمید اختر سے ملنے ریگل سٹینڈرڈ بلڈنگ میں واقع ان کے دفتر پہنچ گیا دوپہر کے بارہ بج رہے تھے اور وہ میری آمد کے منتظر تھے۔

اس سے قبل حمید اختر صاحب سے میری کوئی ملاقات یا خط و کتابت نہیں تھی یہ نہیں کہ وہ میرے نام سے بھی بخوبی واقف تھے یا نہیں لیکن میں ان کی شخصیت اور فن سے بخوبی واقف تھا اس کی وجہ کرشن ادیب تھا جو جناب حمید اختر کا بے حد قریبی دوست ہے اور لدھیانہ میں ہفتہ میں پانچ بار میرے سامنے بیٹھ کر جب اسے گزرے ہوئے وقتوں کا ذکر کرتا تو ساحر لدھیانوی، حمید اختر اور دوسرے تمام دوسرے دوستوں کی میٹھی یادوں کی مٹھاس سے مجھے ہم کنار کراتا۔ ایک بار کرشن ادیب ہی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ تو یاد نہیں کہ حمید اختر سے میرا تعارف کس نے کرایا تھا لیکن اس سے ملنے سے پہلے میں ساحر لدھیانوی سے ذاتی طور پر آشنا ہو چکا تھا غالباً یہ ۱۹۴۵ء کی باتیں ہیں جب متحدہ ہندوستان میں ترقی پسند تحریک عروج پر تھی خود کو کمیونسٹ کہنا، سُرخ سویرے کے خواب دیکھنا، مارکسی ادب پر باتیں کرنا بڑا رومانٹک محسوس ہوتا تھا ہر ادیب، شاعر اور کامریڈ یہ سمجھتا تھا کہ سُرخ انقلاب بس دیوار کھڑا ہے اور اب آیا کہ آیا۔ ان دنوں ہم سب لوگ لدھیانہ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں اکٹھے ہوتے رہتے تھے۔ کامریڈ مدن لعل دیدی، ساحر لدھیانوی، حمید اختر وغیرہ سے ملنے ملانے اور اٹھنے بیٹھنے کا یہی ٹھکانہ ہوا تھا۔ اور یہیں سے حمید اختر سے دوستی ہوئی تھی جو آج بھی اُسی طرح قائم ہے کرشن ادیب اکثر کہتا کہ حمید اختر کا شمار میرے ان دوستوں کی صف میں ہے جن کی قربت کا ایک لمحہ بھی صدیوں کی محبت سے بھی گراں مایہ ہوتا ہے۔

صدق اور خلوص کے اُسی پیکر حمید اختر کو میری نگاہیں برابر دیکھ رہی تھیں اور وہ مسکراتے ہوئے کرشن ادیب کی لدھیانہ کی باتیں مجھ سے کیے جا رہے تھے ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۹ء میں اپنے بھارتی دورے کی باتیں کر رہے تھے پہلی بار لدھیانہ میں ان کا قیام محض رات بھر کا تھا لیکن دوسری بار وہ ابھی ملی کے ہم راہ کئی دنوں تک یہاں رہے۔ وہ گاؤں "تہاڑا"، ضلع لدھیانہ کی جگراؤں تحصیل میں اپنے جنم کی دھرتی بھی دیکھنے گئے اس گاؤں میں ان کے بزرگوں کے مزار ہیں جن پر تقسیم ہند سے قبل ہر جمعرات کو چراغاں ہوا کرتا تھا اور لوگ منتیں مانگا کرتے تھے اتفاقاً اس روز بھی جمعرات کا دن تھا۔ ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا جب انھوں نے دیکھا کہ آج بھی گاؤں کے لوگ اُن مزاروں کی تقدیس دل میں لیے مزار پر جاتے ہیں اور میٹھے چاول بطورِ تبرک تقسیم کرتے ہیں۔ انھوں نے کھنڈروں میں تبدیل ہوا اپنا مکان بھی وہاں دیکھا اور مختلف زاویوں سے اس کی تصویریں اُتاریں انھوں نے لدھیانہ شہر

کی گلیوں، محلوں اور بازاروں کی زیارت کی اور اسے اسکول کے زمانے کی وہ بلڈنگ بھی دیکھی جواُن دنوں ان کا ہوسٹل ہوا کرتا تھا اور جہاں عبادت حیدر کار کے ساتھ وہ رہا کرتے تھے لدھیانہ میں ان کا قیام سجاد زراعتی یونیورسٹی میں تھا جہاں انھوں نے یونیورسٹی کا عجائب گھر بھی دیکھا اور اس سے بے حد متاثر ہوئے۔

ملکی تقسیم سے قبل بمبئی ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا مرکز تھا جہاں سردار جعفری کیفی اعظمی سجاد ظہیر ساحر لدھیانوی، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، ط۔ انصاری کے علاوہ بہت سے صف اول کے قلمکار انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ تھے اور حمید اختر انجمن کے سکریٹری ہوا کرتے تھے جوں جوں ہندوستان کی آزادی کے دن قریب آرہے تھے، فسادات کی آگ شدت سے بھڑک اٹھی تھی ساحر کو اپنی جان بچانے کے لیے بمبئی چھوڑ کر لاہور جانا پڑا اور حمید اختر اسی دوران بہار آگئے اور بعد ازاں انہیں بھی قتل و خون کے سمندر سے گذر کر پاکستان جانا پڑا پاکستان کے وجود میں آتے ہی پہلی پابندی کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین پر لگی اس سلسلے میں حمید اختر کو گرفتار کر لیا گیا اور کافی عرصہ انہیں بغیر مقدمہ چلائے جیل میں بند رکھا گیا غالباً دو تین مرتبہ حمید اختر جیل جاچکے ہیں اور جیل میں رہ کر انھوں نے "کال کوٹھری" کتاب لکھی اس کتاب کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے کر دینے والے مظالم کا پتہ چلتا ہے۔

شہر لدھیانہ کا ذکر

حمید اختر اور ساحر لدھیانوی دونوں کا شہر لدھیانہ ہے اور دونوں میں گہری دوستی رہی ہے ان کے علاوہ ایک اور ادبی شخصیت جناب شمس الحسن چودھری ہیں جو لدھیانہ کے رہنے والے ہیں وہ بھی ساحر اور حمید اختر کے نہایت قریبی دوستوں میں سے ایک ہیں اور جو پہلے لاہور اور پھر لندن میں مقیم ہوگئے ان دنوں بھی وہ لندن ہی میں رہ رہے ہیں بات جناب حمید اختر کی ہو رہی تھی اور مجھے ان کی ماضی کی یادوں کی یاد آرہی تھی ایسے ایک مضمون میں ساحر لدھیانوی کا ذکر کرتے ہوئے حمید اختر نے لکھا تھا ـــــــ " . . ماہنامہ " ادب لطیف کو ابتدا ہی سے ترقی پسند مصنفین کے ترجمان کی حیثیت حاصل رہی ہے ـــــــ ساحر لدھیانوی جب لاہور میں تھا تو ۱۹۴۴ء ۴۵ء

کے موسم گرما میں مجھے بھی لاہور جانے کا موقع ملا ایک سال قبل ساحر کو لدھیانہ گورنمنٹ کالج سے نکال دیا گیا تھا اور اس نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا تھا مقصد پڑھائی ہرگز نہ تھا اس کے بعد وہ بہت کم عرصے میں وہ ایک آدھ بار ہی کالج گیا ہوگا البتہ قیام لاہور میں اس کی ادبی سرگرمیاں کو بڑی وسعت ملی تھی حتیٰ کہ وہ ترقی پسند تحریک کے ترجمان "ادبِ لطیف" کا مدیر بن گیا ——

ساحر لدھیانوی اس رسالے کا مدیر ہوا تو اس نے مجھے واپس لدھیانہ نہیں جانے دیا —— !" ان باتوں کا یہاں ذکر کرنے کا مرا مقصد حمید اختر اور ساحر لدھیانوی کی دوستی کا ذکر کرنا ہے جو بعد میں آئی دوریوں کے باوجود ساحر کی زندگی کے آخری دنوں تک قائم رہی

حمید اختر دراصل دوستیاں بنانے اور نبھانے کے قائل ہیں اور وہی حمید اختر میرے سامنے بیٹھے اپنی کے ساتھ گزرے لدھیانہ، پنجاب اور بھارت کے اپنے دوستوں کی باتیں کرتے رہے میں ان کے دوستوں کی فہرست میں شامل نہیں رہا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ آج انہے دل کی فہرست میں میرا نام بھی انھوں نے درج کرلیا ہے۔ دیگر مصروفیات کے باعث وقت کی کمی تھی اس لئے ہماری ملاقات طویل نہیں رہی گھنٹہ بھر میں نے اُن کی باتوں کا جو لُطف حاصل کیا وہ کئی ملاقاتوں پر بھاری تھا جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو انھوں نے اپنی کتاب 'کال کوٹھڑی' کی ایک جلد مجھے تحفے میں دی۔

جنگ فورم میں

سٹری ایرس کا گلدستہ تھا کہ مجھے یاد تھا اس لیے آج دوپہر کا کھانا میں نے ان کے ہمراہ گھر پر کھایا بعد دوپہر ہمیں جنگ فورم میں مدعو تھا اور اس تقریب کی مدارت سٹری ایرس کو کرنی تھی اس لیے تیار ہو کر بروقت گھر سے روانہ ہوگئے اس شاندار تقریب کا ذکر کرنے سے قبل میں جنگ فورم کے بارے میں بتا دوں روزنامہ جنگ پاکستان کا سب سے بڑا اردو اخبار ہے جس کی روزانہ اشاعت ساڑھے چھ لاکھ کے قریب ہے جنگ فورم کا قیام اسی اخبار کی طرف سے کیا گیا ہے پاکستان میں ادب کھیل علم سائنس یا کسی بھی دوسرے شعبے سے تعلق رکھنے والی کوئی شخصیت دورے پر آتی ہے تو انھیں جنگ فورم میں مدعو کیا جاتا ہے قابل ذکر اور خاص مواقع پر پاکستانی شخصیات کو بھی مدعو کیا جاتا ہے ایوان جنگ کے گراؤنڈ فلور پر ایک نہایت خوبصورت ہال ہے جہاں جنگ فورم کی نشستیں منعقد ہوتی ہیں مہمان کا تعلق جس شعبے سے ہوتا ہے اسی شعبے سے متعلقہ ماہرین کا ایک پینل بنایا جاتا ہے اور مہمان سے بات چیت کرنے کے لیے انھیں بھی شرکت کی دعوت

دی جاتی ہے "جنگ فورم" کی منعقد ہونے والی نشست کے بارے میں ایک یا دو روز قبل باقاعدہ
"جنگ" اخبار میں اعلان شائع کیا جاتا ہے اور عام لوگوں کو بھی اس طرح شمولیت کی دعوت دی جاتی
ہے لیکن یہ لوگ عام طور پر مہمان سے سوال جواب میں شریک نہیں ہوتے بلکہ صرف اجلاس کی کارروائی دیکھ
سکتے ہیں۔ اس جگہ صورت ہال میں سامنے کی طرف بچھا ہوا یا بنی بلیٹ فارم پر ایک بڑا گول میز ہے جس کے
اردگرد مہمان اور ماہرین کی نشستیں ہیں میز پر ہر نشست کے آگے مائکروفون لگا ہوتا ہے۔ اس کے
بالمقابل سامنے کی طرف کارروائی دیکھنے والوں کے لیے ہال میں لگ بھگ دو سو کرسیوں کا انتظام ہوتا ہے۔
جنگ فورم کی کارروائی چلانے کے لیے روزنامہ "جنگ" کا نمائندہ موجود ہوتا ہے یوں کہہ لیں کہ "جنگ فورم"
ایک طرح کا پریس کلب ہے، جس میں مہمان کو بلا کر سامعین کی موجودگی میں ماہرین اس سے انٹرویو کرتے ہیں
"جنگ فورم" میں کسی مہمان کو بلانا ایک طرح سے اس کی عزت افزائی کرنا ہوتا ہے مہمان سے ہونے والی بات
چیت کو باقاعدہ ریکارڈ کیا جاتا ہے اور بعد میں متعلقہ ایڈیشن میں مہمان اور ماہرین کی رنگین تصویروں
کے ساتھ اور بہت اہتمام سے اس انٹرویو کو "جنگ" میں شائع کیا جاتا ہے

روزنامہ "جنگ" کے ادبی ایڈیشن کے انچارج اور مشہور شاعر جناب حسن رضوی نے جب مجھے "جنگ فورم"
میں بطور مہمان شرکت کی دعوت دی تو میں نے سمجھا تھا کہ یہ بھی دوسری منعقد ہونے والی ادبی نشستوں
جیسی ہی ایک نشست ہو گی لیکن بعد میں جب نشتر رحمٰن اور مقبول دہلوی کی زبانی مجھے حقیقت کا علم ہوا تو
ساتھ ہی دو طرح کا ردِّ عمل بھی مجھ پر ہوا فوری ردِّ عمل میری گھبراہٹ تھی کہ نہ جانے ماہرین مجھ سے
کیسا سلوک کریں دوسرا ردِّ عمل یہ تھا کہ میں "جنگ فورم" میں مدعو کیا جانا اپنے لیے فخر کی بات سمجھتا تھا حالانکہ
حقیقت یہ بھی کہ میں تو محض ایک عام انسان اور ادب کا ایک طالب علم ہوں۔ نہ جانے ایک "بڑی ادبی
شخصیت" تصور کر کے مجھے "جنگ فورم" میں کیوں مدعو کیا گیا تھا مجھ میں ایسی تو کوئی بات نہ تھی

"جنگ" کے ساتھ طویل انٹرویو

جب ہم ایوان جنگ میں داخل ہوئے تو میزبان حسن رضوی نے ہمارا استقبال کیا ماہرین کی ٹیم
پہلے ہی سے وہاں موجود تھی۔ ہال میں کافی تعداد میں سامعین بھی موجود تھے ماہرین کی ٹیم (پینل) میں
ڈاکٹر انور سدید، حمید اختر، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر حسن اختر، سائرہ ہاشمی، ڈاکٹر طارق عزیز

قائم نقوی، مقبول دہلوی، سلیم صدیقی وغیرہ اہل قلم حضرات شامل تھے ان میں بیشتر حضرات صفِ اوّل کے نقاد تھے اس اجلاس کی صدارت نسرین رحمٰن نے کی تھی۔ یہ میرے لیے ایک یادگار نہایت دلچسپ تجربہ تھا بعد میں اخبارِ جنگ کے میگزین یعنی خصوصی ہفتہ واری ادبی ایڈیشن میں میرا مسدر جہ ذیل انٹرویو مع رنگین تصاویر کے شائع ہوا تھا ——— اس کا عنوان تھا ———

"بھارت کے مشہور اُردو ہندی افسانہ نگار اور ناول نگار ڈاکٹر کیول دھیر جنگ فورم میں"

سوال ——— آپ نے متعدد ناول اور افسانوی مجموعے شگفتہ اُردو زبان میں لکھے ہیں جس سے محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو اُردو زبان پر کافی دسترس حاصل ہے آپ نے اُردو کب، کہاں اور کیسے سیکھی ——— ؟

جواب ——— جہاں تک زبان کو پڑھنے اور سیکھنے کا سوال ہے، میری عمر کا تھا حصہ پاکستان میں گذرا ہے اتنی ہی میں نے اُردو پڑھی ہے لیکن آدمی کا شوق اور جستجو کبھی ختم نہیں ہوتی وہ اُسے ہمیشہ سفر میں رکھتی ہے چنانچہ میں جب بھی لکھتا ہوں میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ پہلے اُردو میں لکھوں پھر اُسے کسی دوسری زبان میں ڈھالوں ——— ۔

سوال: ——— اب تک کتنی کتابیں آپ لکھ چکے ہیں ——— ؟

جواب ——— اُردو میں دو افسانوی مجموعے "بکھری ہوئی زندگی" اور "پیاداس ای آگ"، اس سے پہلے میں ناول "ہارجیت" ——— "سانجھ کی پرچھائیاں" ——— اور "اتنی سی بات" مارکیٹ میں آچکے ہیں جو تھا ناول میری عمر جاری میں چھپ کر مارکیٹ میں آچکا ہوگا اس کا نام "جینے کی دلواڑ" ہے جو جالندھر دُوردرشن سے ٹی وی سیریل کی صورت میں بھی پیش کیا گیا ہے یہ ناول بھارت میں ہندی زبان میں بھی طبع ہوا ہے۔ ہندی اور پنجابی میں بھی میری کئی ادبی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اس کے علاوہ طبی اور نفسیاتی موضوع پر میری بہت سی کتابیں چھپ چکی ہیں اس طرح کُل ملا کر ساٹھ سے اوپر میری کتابیں شائع ہو چکی ہیں ——— ۔

سوال ——— آپ لکھتے وقت کردار کے نفسیاتی محرک کو کہاں تک بیان کرتے ہیں بطور

حامد حسن کے حوالے سے جو آپ نے لکھا ہے اس میں آپ نے لسانی شعور کو کہاں تک برقرار رکھا ہے ـــــ؟

جواب ـــــ میری ایک حیثیت ڈاکٹر کی بھی ہے ـــــ حسن کا ڈاکٹر ادب کا نہیں ڈاکٹر کی حیثیت سے لسانیات، حسیات اور میڈیکل کے دونوں شعبوں کا مطالعہ میں نے کیا ہے چنانچہ میرا وہ مطالعہ جو میں نے ڈاکٹر کی حیثیت سے کیا ہے اس کے مختلف پہلوؤں کا پورے ادراک کے ساتھ میری ادبی تخلیقات میں آنا بھی فطری بات ہے میں نے اسے اور حسن کی چھاپ نہیں لگائی لیکن جہاں بر انسانی لسانیات کا کوئی پہلو اس حوالے سے میرے سامنے آتا ہے میں نے اس کو اپنی کہانی میں بیان کیا ہے ـــــ ۔

سوال: ـــــ آپ نے منٹو کو تو پڑھا ہی ہوگا آپ کے خیال میں وہ حسن اور لسانیات کے حوالے سے کس پائے کا افسانہ نگار رہے۔ کیا بھارت میں نئے لکھنے والوں پر لسانی اور حسی حوالے سے منٹو کا کوئی اثر ہے ـــــ؟

جواب ـــــ منٹو کی تمام کہانیاں لسانی اور حسی حوالے سے جوڑ کا دینے والی کہانیاں ہیں اُس پر فحاشی کا الزام لگایا ہے لیکن اگر آج ہم اُس کے قلم سے نکلی ہوئی بات کو تسلیم کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے جو لکھا تھا وہ زندگی اور انسانی لسانیات کے قریب تھا۔ میرے خیال میں جتنا منٹو کو بھارت میں غور سے پڑھا اور سمجھا گیا ہے پاکستان میں آنا پڑھا اور سمجھا نہیں گیا جس نے ہاکی اور جوتی سے منٹو نے لکھا ہے اُسی نے ہاکی اور جوتی سے اُس کو بھارت میں پڑھا گیا ہے ـــــ ۔

سوال ـــــ آپ کی کتاب منٹو میرا دوست، کس حوالے سے منٹو سے نسبت پیدا کرتی ہے۔؟

جواب ـــــ منٹو میرا دوست تنقیدی یا تحریاتی کتاب نہیں ہے۔ آج سے لگ بھگ ۲۵ سال پہلے اوپیندر ناتھ اشک کی منٹو میرا دشمن، نامی کتاب چھپی تھی جس میں اشک صاحب نے منٹو کے بارے میں ایسی باتیں لکھی تھیں جو ادب کے پڑھنے والوں کو ناگوار گزری تھیں "منٹو میرا دوست" میں مختلف لوگوں کے مضامین شامل ہیں ایک مضمون میرا بھی ہے ایک طویل مضمون راجہ مہدی علی خان کا بھی ہے اس کتاب میں اشک کی

"منٹو میرا دشمن" پر تنقید نہیں کی گئی بلکہ منٹو کی ادبی حیثیت کو ابھارنے اور نکھارنے کے لیے اشک نیز فنی اور ادبی حوالے سے لکھے گئے کئی مضامین شامل تھے۔ اسے میں نے اور راجہ مہدی علی خاں نے مل کر ترتیب دیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔

سوال ۔۔۔۔۔۔ لاہور میں منعقدہ مختلف تقریبات میں آپ کے کئی افسانے سننے کا موقع ملا ہے جس سے لگتا ہے کہ آپ منٹو کے اسلوب اور فن سے بہت زیادہ متاثر ہیں اس کے بارے میں کچھ فرمائیں ۔۔۔۔۔؟

جواب ۔۔۔۔۔۔ میرے خیال میں کسی کا لاشعوری اثر قبول کر لینا الگ بات ہے لیکن اس کے زیر اثر لکھنا نقل کے برابر ہے یہ بات بھی صحیح ہے کہ جو ادب ہم پڑھتے ہیں اس کا اثر بالواسطہ یا بالواسطہ ہم قبول کر سکتے ہیں ایک قاری کی حیثیت سے میں منٹو سے متاثر ہی نہیں اس کا مداح بھی ہوں لیکن جہاں تک لکھنے کی بات ہے اس میں منٹو کا اثر نہیں، میرا اپنا انداز ہے ۔۔۔۔۔۔

سوال ۔۔۔۔۔۔ آپ کے افسانے حقیقت نگاری کی اس روایت سے متعلق ہیں جو پریم چند سے شروع ہوئی آج کے دور میں حقیقت نگاری پس منظر میں چلی گئی ہے اور اس کی جگہ علامت نگاری اور تجرید کا تجربہ ہو رہا ہے آپ کے ہاں علامت نگاری اور تجرید کا موجودہ رویہ نہیں ہے۔ اس کی کیا وجوہات ہیں ۔۔۔۔۔؟

جواب ۔۔۔۔۔۔ میں واضح طور پر کہتا ہوں کہ میں بطور افسانہ نگار علامتی و تجریدی افسانے کو پسند نہیں کرتا میرے خیال میں حقیقت نگاری کا رویہ ہماری زندگی کے زیادہ قریب ہے۔ آج کے دور میں پہلے ہی انسان تشنج اور تناؤ کے اعصاب شکن دباؤ میں ہے علامتی افسانہ اس دباؤ میں مزید اضافے کا باعث بن جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔

سوال ۔۔۔۔۔۔ آپ کے بعض افسانوں میں فسادات کی صورتِ حال کا تجزیہ بھی ملتا ہے لیکن جس طرح کرشن چندر کے بعض افسانے ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت لکھے گئے جیسے کہ "پشاور ایکسپریس" جس میں انھوں نے اگر دس مسلمان مارے تھے تو ساتھ میں دس ہندو بھی مار دیے تھے بالکل اسی طرح کا رویہ آپ کے ہاں بھی ہے اس کی کیا وجہ ہے۔۔۔؟

جواب ـــــــ میرے جن افسانوں کا ذکر آپ نے کیا ہے وہ مشرقی پنجاب کی پچھلی تین چار سالہ صورتِ حال کے پس منظر میں لکھے ہوئے افسانے ہیں میرے نزدیک ادیب ہمسائے کا تعلق کے حوالے سے لکھتا ہے۔کسی منصوبے کے تحت لکھا ہوا ادب 'ادب نہیں ہوتا ــــ۔

سوال ـــــــ آپ نے فرمایا ہے کہ آپ نے اپنے اُردو افسانوں کو ہندی میں منتقل کیا ہے کہیں ایسا کرتے وقت آپ کے ذہن میں یہ تو نہیں تھا کہ اُردو ہندوستان میں آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے جب کہ ہندی کی اہمیت میں اضافہ ہو رہا ہے ــــ؟

جواب ـــــــ ہمارے ہاں اُردو میں لکھی ہوئی کتاب صرف ایک ہزار چھپتی ہے جو کہ اکثر دوستوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور اگر اسے دوستوں میں نہ تقسیم کیا جائے تو شاید وہ ایک ہزار کتاب کئی سالوں میں بھی ختم نہ ہو۔ اس کے بالمقابل ہندی کا کوئی بھی ناول دس ہزار سے کم تعداد میں نہیں چھپتا اس کے علاوہ کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا ایک ایڈیشن پچاس ہزار کے قریب چھپتا ہے۔ایسی صورتِ حال میں ہر قلم کار کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا لکھا ہوا زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے اسی حوالے سے میں نے ہندی میں زیادہ لکھا ہے لیکن اس کے باوجود میری اُردو سے محبت ختم نہیں ہوتی ــــ۔

سوال ـــــــ دہلی سے یہاں آنے والے لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں اُردو زبان پہلے کی نسبت آگے بڑھ رہی ہے۔کیا بھارتی پنجاب میں بھی ایسی صورتِ حال ہے یا اس کے برعکس ہے ــــ؟

جواب ـــــــ پنجاب میں ذریعۂ تعلیم پنجابی ہے وہاں اُردو کسی بھی سطح پر رائج نہیں ــــ۔

سوال ـــــــ ایشیا کا ایک بہت بڑا ایوارڈ آپ کو ہندی کتاب پر ملا تھا یا اُردو کتاب پر؟

جواب ـــــــ یہ ایوارڈ مجھے اپنے مجموعی کام پر ملا تھا ــــ۔

سوال ـــــــ کیا ہندوستان میں اُردو زبان کے تحفظ کے لیے کوئی پروگرام یا کوشش سرکاری سطح پر ہو رہی ہے اور کیا سہ لسانی منصوبہ اس تحفظ میں کوئی مددگار ثابت ہو سکتا ہے ــــ؟

جواب ـــــــ سہ لسانی منصوبہ یقیناً اس سلسلے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے میں ابھی صرف

پنجاب کے حوالے سے بات کر رہا ہوں جہاں تک پورے ہندوستان کا تعلق ہے اب
صوبۂ بہار میں اُردو کو دوسری زبان کا درجہ حاصل ہے ہمارے ہاں بیرہ صوبوں میں
اُردو اکادمیاں بنی ہوئی ہیں جن صوبوں میں ایسی اکادمی نہیں ہے وہاں لنگوالسٹ
(Languages Department) ہیں پنجاب میں اب اُردو نہیں کے برابر
ہے لہٰذا یہاں اُردو بولنے والوں کی تعداد بھی نہیں کے برابر ہے لیکن اس کے باوجود
جتنے اردو مشاعرے پنجاب میں منعقد ہوتے ہیں' شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے
صوبے میں منعقد ہوتے ہوں اور ان میں شریک ہونے والے نوجوانوں کی تعداد ثابت
کرتی ہے کہ آئندہ نسل یقیناً اُردو کو ساتھ لے کر چلے گی ۔ ویسے بھی ہندوستان میں ہر
زبان کی سالانہ ادبی رپورٹیں کتابچے کی صورت میں شائع ہوتی ہیں جن سے اُردو کی
مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے بھارتی پنجاب میں ہر ضلع ہیڈکوارٹر میں سرکاری
طور پر زبان کو فروغ دینے کے لیے اس کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے ـــــ!

سوال ـــــ ہر ادب کے سامنے اس کے عہد کے تقاضے ہوتے ہیں جن کی بنا پر وہ ادب تخلیق کرتا
ہے ہندوستان کے افسانہ نگاروں کے سامنے اس وقت کون سے ایسے موضوعات ہیں جن
کے حوالے سے وہ افسانے لکھ رہے ہیں ـــــ؟

جواب ـــــ زندگی اور اس کی ضروریات و مسائل کے حوالے سے ہماری سماجی زندگی کا
کینوس بہت وسیع ہے اور ہمارا افسانہ نگار اسی حوالے سے شاندار افسانہ نگاری
کر رہا ہے ـــــ!

سوال ـــــ آپ ہندی' اُردو اور پنجابی زبانوں میں لکھتے ہیں زبان بدلنے سے لکھنے میں
کوئی اُلجھن تو محسوس نہیں ہوتی ـــــ؟

جواب ـــــ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے اور یہ قدرتی بات ہے ـــــ!

سوال ـــــ پنجاب اور خصوصاً لدھیانہ میں اُردو لکھنے والے کون سے بڑے ادیب ہیں ـــــ؟

جواب ـــــ کرشن ادیب' آزاد گلاٹی' شروں کمار ورما' اس۔ کے راماں' اکتمری لعل راکر
وغیرہ بہت اچھا لکھنے والے ہیں اور بھی کئی لوگ ہیں ـــــ!

سوال ——— آپ ٹیلی ویژن رائٹر بھی ہیں۔ آپ کے نزدیک ہماری اور آپ کی رائٹنگ میں بنیادی فرق کیا ہے ——— ؟

جواب ——— ہماری ہاں پابندی بہت کم ہے وہاں ہم ہر بات آزادی سے کہہ سکتے ہیں ——— ۔

سوال ——— پاکستانی ٹیلی ویژن ڈرامے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے ——— ؟

جواب ——— پاکستانی ٹیلی ویژن ڈرامہ مجموعی طور پر ہندوستانی ڈرامے سے بہتر ہے

سوال ——— ہندوستان کے دیومالائی تصور اور وہاں کی بہت سی ثقافتی روایات کے حوالے سے ہاں کے ادب کو بہت آگے ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کی وجوہات کیا ہیں ——— ؟

جواب ——— آپ کی اس رائے سے میں متفق نہیں ہوں مجموعی طور پر ہندوستانی ادب بہت آگے ہے چونکہ یہاں کے لوگ بھارت کی رسائل نہیں جاتے اور آپ کے پاس وہ کتابیں ہی نہیں پہنچتیں اس لیے آپ صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے ——— ۔

سوال ——— ہندوستان میں اُردو اخبارات کتنے مقبول ہیں ——— ؟

جواب ——— بھارتی پنجاب جو کبھی اُردو کا گہوارہ رہا ہے اور جہاں آج اُردو سسک رہی ہے وہاں جالندھر سے شائع ہونے والا اُردو روزنامہ "ہند سماچار" طباعت، گیٹ اَپ، سرکولیشن اور ہر لحاظ سے بھارت کا صفِ اوّل کا اخبار ہے اس کے علاوہ بھارت کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے کئی اور اخبار بھی ہیں جو کافی مقبول ہیں ——— ۔

سوال ——— آج کل ہندوستان اور پاکستان کے روابط بہت آگے بڑھ رہے ہیں ہمارے ہاں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ بھارتی حکومت اور عوام نے پاکستان کو ابھی تک دل سے تسلیم نہیں کیا۔ آپ ادیب ہونے کے ناطے کیا محسوس کرتے ہیں ——— ؟

جواب ——— اس سوال کا کچھ حصّہ سیاسی ہے جس پر میں گفتگو نہیں کر سکتا لیکن آپ کا تاثر صحیح نہیں ہے عوامی رشتوں کے حوالے سے جو بات آگے چلی ہے اس کو دونوں ملکوں کے عوام نے اچھے تاثر کے ساتھ قبول کیا ہے اب اگر یہ صورتِ حال پیدا ہوئی ہے تو اسے جلد از جلد مزید استوار کر لینا چاہیے ——— ۔

آپکے زیادہ تر افسانے رومانوی نوعیت کے افسانے ہیں۔ اس کی کیا وجوہات ہیں کیا آپکے سرد نک تحت کا مسئلہ ہی بنیادی مسئلہ ہے ــــــ؟

ــــــ شاید آپ نے میرے صرف رومانی افسانے ہی پڑھے ہیں اور جن افسانوں کی بات آپ کی ہے ان کے علاوہ بھی میری بہت سی کہانیاں ہیں جو کہ اپنے موضوع اور اسلوب کے حوالے سے بہت مختلف ہیں ــــــ ۔

سوال ــــــ ہمارے ہاں جو افسانہ نگار انڈیا سے ہجرت کرکے تقسیم کے بعد یاکستان آئے ہیں اُن کے ہاں ابھی تک اپنی چھوڑی ہوئی مٹی کی بو باس رچی ہوئی ہے ان کی تحریروں میں آج بھی یہ احساس موجود ہے جس کی سب سے بڑی مثال انتظار حسین ہیں۔ آپ بھی سا ہیوال پاکستان سے ہجرت کرکے اُدھر گئے ہیں۔ کبھی آپ نے بھی اپنے اندر اس جذبے کو محسوس کیا جو کہ ہجرت کے عمل سے پیدا ہوتا ہے اور جسے انتظار حسین نے شدت سے محسوس کیا ــــــ؟

جواب ــــــ ایسا ہر حساس ادیب کے ساتھ ہوتا ہے اور میرے ساتھ بھی ہوا۔ میرے بہت سے افسانے اسی جذبے کے گرد سفر کرتے ہیں ــــــ ۔

سوال ــــــ آپکے افسانوں کے حوالے سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ آپ ترقی پسند تحریک کے ساتھ وابستہ نہیں رہے۔ آپکا اس سلسلے میں کیا خیال ہے ــــــ؟

جواب ــــــ ادب میں مختلف اسکول آف تھاٹ ہوتے ہیں کسی خاص موضوع کو کسی خاص سوچ کے حوالے سے لکھنے سے میرے خیال میں اس کا کینوس محدود ہو جاتا ہے اور اس کے خطرناک نتائج بھی برآمد ہو سکتے ہیں۔ میں ادب میں گروہ بندیوں کا قائل نہیں میں خاموشی سے لکھتا رہتا ہوں کسی گروہ سے وابستگی ضروری نہیں سمجھتا ــــــ ۔

سوال ــــــ ترقی پسند تحریک کے ادب پر اثرات کے بارے میں آپکا کیا خیال ہے ــــــ؟

جواب ــــــ جب تحریک شروع ہوئی، اُس وقت بھی لوگ لکھ رہے تھے آج بھی لکھ رہے ہیں۔ ادب کو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا اور پھر وہ مخصوص نوعیت کے وقتی مسائل جنہوں نے اس تحریک کو جنم دیا تھا آج ایک مختلف نوعیت اختیار کر چکے ہیں ــــــ ۔

سوال ——— آپ کے خیال میں جن حالات میں ترقی پسند تحریک پیدا ہوئی تھی وہ صورت حال تبدیل ہو چکی ہے ——— ؟

جواب ——— اُس وقت کے مسائل اُس وقت کے مسائل تھے، آج کے مسائل آج کے مسائل ہیں ——— ۔

سوال ——— ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں میں کون سی قدر مشترک ہے اور کون سی مختلف ——— ؟

جواب ——— دونوں طرف کا ادب اور ادیب کم و بیش ایک جیسے ہی ہیں ۔

سوال ——— آپ نے یہاں کیا محسوس کیا اور کیا پیغام آپ یہاں سے اپنے وطن کے لیے لے کر جائیں گے ——— ؟

جواب ——— یہاں سب لوگ بہت اچھے ہیں بے پناہ محنت کرنے والے ہیں یہی احساس اور پیغام لے کر میں اپنے وطن جاؤں گا ——— ۔

باتیں ادب کی

"جنگ فورم" میں مجھ سے کیا گیا انٹرویو بہت طویل تھا جسے "جنگ" اخبار کے پورے ایک صفحہ پر اختصار سے پیش کیا گیا۔ انٹرویو ختم ہونے کے بعد چائے کی چسکیوں کے دوران آپس میں بہت سی رسمی اور غیر رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے کتابوں کی رسم اجرا کی تقریبات اور کتابوں پر ملنے والے سرکاری، نیم سرکاری انعامات کا موضوع چھیڑ دیا۔ میں نے کہا کہ یہ روایت دونوں ملکوں میں قائم ہے کسی کتاب کی رسم رونمائی کی تقریب منعقد ہو تو کوئی بُری بات نہیں ہے اس سے ادب اور اس کی تخلیق کے بارے میں لوگوں کو زیادہ واقفیت حاصل ہوتی ہے لیکن دیکھا گیا ہے کہ ایسی تقریبات کا سہارا عام طور سے ذاتی تشہیر کے لیے لیا جاتا ہے یہ بُری بات ہے۔ تقریب منعقد ہوگی تو تھوڑی بہت تشہیر تو ہوگی ہی لیکن تقریب شہرت کی بیساکھی نہیں بنی چاہیے۔ محمد اختر نے کہا کہ ہم نے تو کوئی ایسی تقریب نہیں دیکھی جس میں رُونما والی کتاب پر تنقیدی نقطۂ نظر سے بات کی جاتی ہو کتاب پر کم اور کتاب والے کی تعریف پر زیادہ مقالے پڑھے جاتے ہیں۔ میں نے اپنی ایک کتاب "ایسا دامن اپنی آگ" کی رُونمائی

کا ذکر حسن جیسن کی تقریب عالب اکادمی دہلی میں انجمن ترقی اُردو ہند، اُردو بیرو موتس بیورو، اُردو اکادمی کی طرف سے مشترکہ طور پر منعقد کی گئی تھی اور جس میں جناب جگدیش ریال، ڈاکٹر خلیق انجم جناب مالک رام جیسی قدآور شخصیات نے مقالے پڑھے تھے یا تقریریں کی تھیں قلم کار کی موجودگی میں اس کی تحلیقات پر جس طرح سے صحت مند تنقیدی جائزہ لیا گیا تھا یہ اسی مثال آپ تھا حمیدا ختر نے کہا کہ یہ ایک اچھی بات ہے لیکن عموماً ایسا ہوتا نہیں۔

ادبی انعامات

کتابوں پر ملنے والے سرکاری اور نیم سرکاری انعامات پر ہوئی بات چیت بہت دلچسپ تھی ڈاکٹر انور سدید کا کہنا تھا کہ کسی کتاب یا ادیب کو انعام مل جانے سے اس کی ادبی حیثیت میں مطلقاً کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ نہ ہی ایسے انعامات کسی ادیب یا شاعر کا مرتبہ متعین کرنے میں کوئی معاون کرتے ہیں اُن کا خیال تھا کہ کچھ عرصے کے لیے اُسے شہرت ضرور مل جاتی ہے انعامات کی تقسیم میں ذاتی پسند یا ناپسند کو بہت دخل حاصل ہے۔ اس میں پست درجے کی سیاست بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ گروہ بندی کے اثرات بھی در آتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان میں ایک زمانے میں آدم جی ایوارڈ سب سے بڑا انعام تھا لیکن یہ انعام "آگ کا دریا"، "گولی اور" علی پور کا ایلی" کو نہیں ملا جب کہ یہ دونوں کتابیں اُردو ادب کی پہچان کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس جو کتابیں انعام یافتہ قرار دی گئیں آج ان کا ذکر تک سننے میں نہیں آتا سائرہ ہاشمی نے بھی اس بات کی تائید کی

مجھ سے پوچھا گیا کہ بھارت میں بہت سے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی طرف سے بے شمار انعام تقسیم کیے جاتے ہیں۔ وہاں اس کا کیا طریق کار ہے؟ میں نے ڈاکٹر انور سدید کی بات کو دوہراتے ہوئے کہا کہ میں یہ تو نہیں کہتا کہ تمام انعامات سفارشوں اور اثر و رسوخ ہی سے ملتے ہیں لیکن عموماً ایسا ہوتا ہے میں نے بغیر نام کا ذکر کیے ایک ایسے ہندوستانی ادیب کی کہانی سنائی کہ جو محض دو کتابوں کا مصنف ہے اور جس کا ادبی کیریئر بھی محض پانچ چھ سال کا ہے اپنی تصنیفات پر انعام حاصل کرنے کے لیے اُس نے بہت بھاگ دوڑ کی۔ انعام کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی کے ممبران تک رسائی حاصل کی۔ اُن کے ملنے جلنے والوں اور رشتہ داروں سے سفارشی خطوط لیے متعلقہ

ملک کے وزیر (جو اس کمیٹی کے چیئرمین ہوتے ہیں) کے پاؤں میں اپنی پگڑی رکھی اور آخر کار انعام حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے۔ بعد میں یہ چلا کہ جتنی رقم کا انعام انھیں حاصل ہوا ہے اُس سے کئی گنا زائد رقم وہ انعام حاصل کرنے کی کوششوں پر خرچ کر چکے ہیں۔ ادبی انعامات حاصل کرنے کا یہ طریقہ مختلف شکل و صورت میں اکثر استعمال ہوتا ہے۔ اس پر کئی قہقہے بلند ہوئے اور پھر پاکستانی ادیبوں کی ملتی جلتی کئی کہانیاں سننے کو ملیں۔

یہ تو ہوئی ایسے نام نہاد ادیبوں کی بات جن کی نظر ادب پر نہیں، ادبی انعام پر ہوتی ہے اور جو انعام حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ جو انعامات بغیر کسی سفارش کے بھی دیے جاتے ہیں ان کا طریق کار ایسا نہیں کہ جسے منصفانہ کہا جا سکے۔ مختلف اکادمیوں اور سرکاری اداروں کی طرف سے ہر سال انعامات دیے جاتے ہیں۔ طریق کار یہ ہے کہ اکادمیاں یا ادارے ہر سال ایک خاص تاریخ تک چار سے آٹھ جلدیں فی کتاب قلم کاروں سے انھیں انعام دینے کے لیے غور کرنے کے مقصد سے منگواتی ہیں۔ اگر کوئی ادیب اپنی کتاب بھیجنا نہیں چاہتا یا کوئی ادیب مقررہ تاریخ تک کسی مجبوری کے باعث کتاب بھیج نہیں پاتا تو وہ کتاب انعام کی حق دار نہیں ہو سکتی۔ ایسی کتاب کی عدم موجودگی میں جب کسی دوسری کتاب پر اس سال کا "بہترین ادبی انعام" دیا جاتا ہے تو کیا ہم مان لیں کہ واقعی انعام کے لیے چُنی گئی کتاب بہترین ادبی تخلیق ہے؟

تحائف کی بھرمار

اسی طرح کے بہت سے موضوعات پر گفتگو آئی اور جب ہم رخصت ہونے لگے تو وہاں موجود بہت سے ادیب دوستوں نے مجھے اپنی کتابوں کے تحفے پیش کیے۔ مقبول دہلوی اور بشریٰ رحمٰن کی سیکریٹری اگر مدد نہ کرتے تو اتنی ڈھیر ساری کتابوں کو باہر کھڑی گاڑی تک پہنچانا مشکل ہو جاتا۔ روزنامہ "جنگ" کے دفاتر جو اوپری منزلوں پر واقع ہیں دیکھنے کی میری خواہش تھی لیکن توقع سے کہیں زیادہ وقت جنگ فورم کی نشست میں لگ گیا تھا اس لیے ہم وہاں سے گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں آج کی نشست کے بارے میں بشریٰ رحمٰن نے کہا کہ یہ ایک نہایت ہی کامیاب نشست تھی۔ میں نے کہا کہ میرے لیے یہ ایک دلچسپ تجربہ رہا۔ اخبارات، جریدوں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے میں نے بہت سارے انٹرویو دیے ہیں

لکن وہاں انٹرویو کرنے والے ایک صاحب ہوتے ہیں اور ایک آدمی کے سوالات کا وار سہنا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن یہاں تو سوالات اور پھر ضمنی سوالات کرنے والے درجن بھر ماہرین صفِ اوّل کے نقاد اور ماہرین تھے۔ اوران سے بیشتر لوگ مجھ سے بہت سینئر تھے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اچانک ہونے والے آج کے اس امتحان میں میں کامیاب رہا ہوں لتیری نے مسکراتے ہوئے کہا کہ تمھی صرف کامیاب ہی نہیں بلکہ میرٹ لسٹ میں آئے ہو۔

تب ساڑھے نو بجے کے قریب مسز کرسٹی ادیب کے بھائی مسٹر جون ولیم اچانک ملنے آگئے جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کرسٹی ادیب کے سسرال پاکستان میں ہیں اور بیگم کرسٹی ادیب کے تین بھائی وہاں رہائش پذیر ہیں اور تینوں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں سب سے بڑے مسٹر ولیم لاہور کے ایک بہترین تعلیمی ادارے ڈاں باسکو اسکول کے پرنسپل ہیں دوسرے کلمینٹ ولیم دیال سنگھ کالج میں پروفیسر ہیں اور تیسرے جون ولیم انکم ٹیکس افسر ہیں جون ولیم صاحب کو میں نے لاہور پہنچنے کے دوسرے روز ہی ایک خط پوسٹ کیا تھا جو شاید انھیں کافی تاخیر سے ملا جون ولیم بیگم کرسٹی ادیب اور بچوں کے لیے حد تحائف لائے تھے جو میں نے اسی بیگ میں ڈال دیے جو حمد اختر نے تحفوں سے بھر کر کرسٹی ادیب کے لیے مجھے دیا تھا۔ کافی دیر وہ مجھ سے باتیں کرتے رہے انھوں نے مجھے اپنے یہاں آنے کی دعوت بھی دی لیکن میں نے معذرت طلب کی کیوں کہ میرے پاس صرف ایک دن کا وقت تھا اور پرسوں صبح ہی واپسی کا پروگرام تھا۔ اس ایک دن میں ابھی کئی کام کرنے تھے اور سے سامان کو اور تحائف کو سمیٹ کر واپسی کی تیاری کرنی تھی

واپسی سے ایک دن پہلے

۲۹ جنوری کو صبح ہی جناب عطاء الحق قاسمی کا فون آیا کہ آج بعد دوپہر تین بجے میں نوائے وقت کے دفتر میں آجاؤں اپنے اخبار کے ادبی ایڈیشن کے لیے وہ مجھے انٹرویو کرنا چاہتے تھے میں نے کہا کہ اتنی بار ہم مل لیے، اتنی ساری باتیں کرتے رہے اب کیسا انٹرویو لینا چاہتے ہو؟ عطاء الحق قاسمی سے بحث کرنا فضول تھا وہ بضد تھے کہ بس میں چلا آؤں۔ دعوت کم اور حکم زیادہ تھا جسے سرِ تسلیم خم، کہتے ہوئے میں نے قبول کر لیا۔

میں نے بشریٰ رحمن سے کہا کہ آپ وہ خط لکھ دیں جو بھارت میں اپنے دوستوں کو آپ ارسال کرنا چاہتی ہیں انھوں نے حیران ہوتے ہوئے وجہ پوچھی تو میں نے یاد دلایا کہ کل صبح ہی مجھے واپس جو جانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کل روانگی کا پروگرام اچانک کیسے بن گیا ــــــ آپ تو اگلے ماہ کے دوسرے ہفتے میں جانے والے تھے شاید انھیں غلط فہمی ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ پریشان ہوگئی تھیں میں نے کہا کہ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے تو کہنے لگیں کہ میں نے جمعہ کے روز اپنے گھر پر ایک ادبی نشست منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں جناب ممتاز اور طفیل صاحب سے بات بھی کی تھی میری خواہش تھی کہ آپ کے تمام دوستوں کے علاوہ اُن ادیبوں اور شاعروں کو بھی دعوت دوں جن سے آپ مل نہیں سکے آج ہی میں راولپنڈی، اسلام آباد وغیرہ بعض دوستوں کو فون کرنے کا پروگرام بنا رہی تھی طاہرہ کو میں نے کہا تھا کہ وہ فہرست تیار کرے اور آپ بھی اسے ایک نظر دیکھ لیں تاکہ کوئی رہ نہ جائے۔ میں نے کہا کہ یقیناً یہ بات میرے لیے باعث فخر ہوتی لیکن میرے پاس اتنی ویزا کی معیاد تو ہے، سرکاری چھٹی ختم ہو رہی ہے اور یہی میری سب سے بڑی مجبوری ہے۔ میں دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا کہ بشریٰ سچ مچ بہت پریشان ہیں میرے بس میں ہوتا تو ان کی پریشانی کو ختم کرنے کے لیے فوراً ہی مزید کچھ دن رکنے کی بات کہہ دیتا لیکن میں بے بس تھا بشریٰ نے اپنے آج کے سبھی پروگرام منسوخ کر دیے اور اپنی نگرانی میں نوکروں سے میرا سامان پیک کرواتی رہیں ــــ بشریٰ کی کتابوں کی کئی کئی جلدیں تھیں۔ نے شمار کتابیں اور تحائف تھے میرے لیے اور کچھ دوستوں کے لیے 'وطن دوست' کے نہایت خوب صورت کیلنڈر رکھے جن پر بشریٰ نے اپنے دستخط کر دیے تھے

قبل از دوپہر لاہور پولیس اسٹیشن جا کر میں نے لاہور سے واپسی کی اطلاع درج کرائی مقبول دہلوی میرے ساتھ تھے اس لیے بغیر کسی پریشانی کے یہ کام بہت جلد ہو گیا اپنے دوستوں کی فرمائش کی چند چیزیں اور کچھ کتابیں بھی حاصل کیں۔

روزنامہ "نوائے وقت" کے دفتر میں

بعد دوپہر میں نے روزنامہ "نوائے وقت" کے دفتر میں پہنچ کر عطاالحق قاسمی کے حکم کی تعمیل

کی درا صل انٹرویو تو وہ پہلے ہی لکھ بیٹھے تھے۔ انہیں میری چند رنگین تصویریں درکار تھیں اور اسی سلسلے میں انھوں نے مجھے ایوانِ وقت میں آنے کی دعوت دی تھی۔ میں روزنامہ "جنگ" کے دفاتر تو نہیں دیکھ سکا تھا اسی بہانے "نوائے وقت" کے دفاتر دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔

روزنامہ "نوائے وقت" کے دفاتر ایک بڑی اور شاندار عمارت میں واقع ہیں۔ داخل ہوتے ہی نچلی منزل پر ریسپشن ہے جہاں سے گذر کر اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا ہوتا ہے اسی جگہ مقامی خبریں وصول کرنے کا انتظام بھی ہے جو لوگ مختلف قسم کی مقامی خبریں اخبار میں اشاعت کے لیے دیتے ہیں وہ یہاں وصول کی جاتی ہیں اور ان کا اندراج ایک رجسٹر میں کر لیا جاتا ہے بعد میں ان خبروں کو اوپر ادارتی شعبے میں بھیج دیا جاتا ہے۔

"نوائے وقت" میں کام کرنے کا ڈھنگ بالکل بھارتی اخباروں جیسا ہی ہے۔ مجھے دہلی اور جالندھر کے بعض بڑے اخبارات کے دفتر دیکھنے کا موقع ملا ہے لگ بھگ تمام اخبارات کے ادارتی شعبے ایک سے ہیں اردو اخبارات میں روزنامہ "ہند سماچار" ہی بھارت کا سب سے بڑا اخبار ہے جس کی طباعت اور اشاعت میں کمپیوٹروں کا استعمال بھی ہوتا ہے کیں بتا دوں کہ اسی ادارے سے ہندی روزنامہ "پنجاب کیسری" اور پنجابی اخبار "جگ بانی" بھی شائع ہوتے ہیں ہندی اخبار کی اشاعت سب سے زیادہ ہے اور تینوں اخباروں کی روزانہ اشاعت غالباً آٹھ لاکھ سے زائد ہے بھارت کے دوسرے بڑے اخبار "ہندو" ——— "ہندوستان ٹائمز" ——— "انڈین ایکسپریس" ——— "ٹائمز آف انڈیا" اور ان کے ہندی ایڈیشن ہیں پنجاب سے پنجابی زبان میں شائع ہونے والا سب سے بڑا اخبار روزانہ "اجیت" ہے پنجاب سے روزانہ "ٹریبون" بیک وقت انگریزی ہندی اور پنجابی تین زبانوں میں شائع ہوتا ہے

اخبار "نوائے وقت" آفسٹ پر شائع ہوتا ہے اور اس کی طباعت و اشاعت میں بھی کمپیوٹر کا استعمال کیا جاتا ہے چھپائی کا کام نہایت اعلیٰ و جدید ترین مشینوں پر ہوتا ہے۔ روزنامہ "جنگ" کی طرح "نوائے وقت" بھی چھپائی کے لحاظ سے بہت خوبصورت اور پرکشش اخبار ہے۔ ان اخباروں کی ضخامت اور قیمت بھارت کے اخباروں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ادب، کھیل کود، فلم، ٹیلی ویژن، بچوں کے لیے اور ہفتہ واری میگزین ایڈیشن نہایت پرکشش، معلوماتی اور رنگین

ہوتے ہیں اُن کے مقابلے میں بھارت کا کوئی بھی اخبار اس طرح کے خصوصی ایڈیشن شائع نہیں کرتا
اس لحاظ سے پاکستان کے اُردو اخباروں کو برتری حاصل ہے

ایک گھر سے دوسرے گھر کو واپسی

۳ جنوری ــــــــ پاکستان میں میرے دورے کی آخری تاریخ تھی واپسی سفر کی تیاری رات ہی مکمل ہوچکی تھی صبح دس کے بعد روانگی کا پروگرام تھا تاکہ واہگہ بارڈر پر کسٹم کی کارروائیوں سے فارغ ہوکر بروقت میں امرتسر ہوتا ہوا لدھیانہ پہنچ سکوں میں نے اپنی واپسی کی تشہیر نہیں کی تھی تاکہ بلاوجہ دوستوں کو پریشانی نہ ہو۔ پھر بھی خاص احباب کو آج میری واپسی کا علم ہوگیا تھا۔ صبح ہی سے ان کے فون آنے لگے تھے سب سے پہلا فون سائرہ ہاشمی کا تھا۔ جناب محمد طفیل، ڈاکٹر انور سدید، فرحت اودھی اور صابر لودھی، ڈاکٹر آسا سہیل اور عطاء الحق قاسمی کے فون بھی تھے ــــــــ اور تمام دوست احباب کی خواہش تھی کہ میں کچھ دن اور رُک جاؤں ہر آواز میں بے پناہ محبت تھی میں انھیں دیکھ نہیں پارہا تھا لیکن محسوس کر رہا تھا کہ محبت کے یہ الفاظ محض رسمی نہیں تھے بلکہ ان میں دل کی دھڑکنیں شریک تھیں، جذبات شریک تھے اور اپنے پن کی وہ گرمی تھی جو دھڑکتے ہوئے دل اور مچلتے ہوئے جذبوں ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

قتیل شفائی ہمیں رخصت کرنے آئے

یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ میرے محترم دوست جناب قتیل شفائی کی آمد کی اطلاع نوکر نے دی۔ میں نے باہر آکر انھیں خوش آمدید کہا اور پھر اپنے کمرے میں لے آیا۔ میرے بندھے اور بکھرے ہوئے سامان کو دیکھ کر قتیل شفائی کہنے لگے کہ ایسے لگتا ہے جیسے کوئی اپنے سارو سامان کے ساتھ گھر تبدیل کر رہا ہو ــــ میں نے کہا کہ گھر ہی تو تبدیل کر رہا ہوں ــــ ایک گھر (پاکستان) سے دوسرے گھر (بھارت) کو روانگی کے سفر کی تیاری ہے۔ میرے ساتھ وہ بھی مسکرادئے لیکن ہماری مسکراہٹوں میں توجہ نہیں ایک عجیب سی کسک تھی جو سچ مچ ہی اپنا گھر چھوڑنے کے لمحوں کے احساس سے پیدا ہوتی ہے میں نے قتیل شفائی کے چہرے کو بغور پڑھنے کی کوشش کی اور محسوس کیا کہ کسک کے ان لمحوں

سے وہ تب تک مرور گزرے ہوں گے تب جب بھی بھارت کے دورے کے بعد پاکستان ان کی واپسی ہوئی ہوگی۔

قتیل شفائی میرے لیے غزلوں کے کیسیٹ لائے تھے۔ کچھ اور بھی تھا اور ان تحفوں کو جوم کر میں نے قریب بڑے سمارت تحائف میں شامل کرلیا تھا قتیل شفائی کہنے لگے کہ گذشتہ دنوں ان کی مصروفیات کچھ ایسی رہیں کہ کئی بار انھیں لاہور سے باہر جانا پڑا اور یہ کہ وہ زیادہ وقت میرے ساتھ نہیں گزار سکے انھوں نے امید ظاہر کی کہ میرا دورہ پاکستان کامیاب رہا ہوگا۔ میں نے کہا کہ محبت کی دولت سے مالامال ہوکر وطن لوٹ رہا ہوں مجھے کسی کا ایک شعر یاد آگیا ـــــــ

پردیس میں وہ پیار ملا ہے نہ پوچھیے
اپنے بھی گھر کو جانے کی خواہش نہیں ہوئی

تھی تو کو میں کمرے ہی میں ناشتے کی ٹرالی لے آیا قتیل شفائی نے ناشتے پر میرا ساتھ دیا لگ بھگ آدھا گھنٹہ وہ میرے ساتھ رہے وداع ہونے لگے تو اپنی گاڑی میں سے کمرہ اٹھالائے اور ڈرائیور کو تصویر اتارنے کے لیے کہا۔ نسرین رحمٰن کے بنگلے کے خوبصورت لان میں کمرے کی فلمیں نے ہمیں محبت کی ایک یادگار کے روپ میں اپنے اندر سمیٹ لیا۔

آج یہاں صوبائی اسمبلی کا اجلاس شروع ہو رہا تھا اور نسرین رحمٰن کو اجلاس میں شرکت کے لیے جانا تھا اُن کی شدید خواہش تھی کہ وہ واگہ بارڈر تک مجھے وداع کرنے جائیں لیکن میں نے منع کر دیا۔ میرے منع کرنے کے باوجود جھلاوہ جانے والی تھیں لیکن بہت اہم اجلاس میں شرکت کرنے کی ان کی مجبوری تھی واگہ بارڈر تک میرے سفر کے بارے میں اپنے ڈرائیور کو انھوں نے ضروری ہدایات دیں اور پھر ایک بڑا سا پیکیٹ کمرے میں سامان کے ساتھ رکھواتے ہوئے کہنے لگیں ـــــــ "اپنی بہن کی طرف سے یہ ایک چھوٹا سا تحفہ ہے، قبول کریں" میں نے بہت بار انکار کیا لیکن سب بے سود تھا تھی تو کر ایک بھاری کریٹ لیے کمرے میں داخل ہوا میں نے پوچھا اس میں کیا ہے تو کہنے لگیں ـــــــ "کینو تو بھارت میں بھی ہوتے ہوں گے لیکن پاکستان کے کینو بہت میٹھے اور لذیذ ہوتے ہیں" میں کچھ کہنے لگا تو انھوں نے بات بدل دی ـــــــ "سامان واقعی بہت ہوگیا ہے لیکن امید ہے کہ کسٹم والے آپ کو پریشان

نہیں کریں گے ـــــ سفر میں سامان کے ساتھ ساتھ اپنا بھی خیال رکھیں ـــــ لدھیانہ پہنچتے ہی اپنی خیریت سے بذریعہ تار مطلع کریں ـــــ کانت بھائی کو میرا سلام کہیں ـــــ انل اور بھارتی کو میری طرف سے پیار کا بوسہ دیں ـــــ جناب وشو کمار جوہڑا، یونس دہلوی، رئیس مرزا اور کچھ دوسرے لوگوں کے نام میرے خطوط اُن تک پہنچا دیں ـــــ ۱"

میں خاموشی سے سُن رہا تھا لستری کے الفاظ میں وہ روانی نہیں تھی ـــــ آواز میں سوز کا وہ انداز نہیں تھا جو گذشتہ کئی دنوں سے میں روز ہی سُنتا اور محسوس کر رہا تھا آج اس کی آواز میں جذبوں کی شدت تھی اور جیسے ایک ایک لفظ وہ مشکل کہہ رہی تھی ـــــ ' شاید ہم آپ کی خدمت نہ کر سکے ہوں ـــــ شاید ہماری وجہ سے آپ کو پریشانی ہوئی ہو ـــــ شاید... ۱"
اور لستری کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں جذبوں نے اُن کے مکمل وجود کو جیسے باندھ لیا تھا ایک بہن کی ممتا پگھل کر جیسے ساگر بن گئی تھی ـــــ اور اس کی لہروں نے میرے دل میں عجیب سی ہلچل برپا کر دی تھی جو میں کہنا چاہ رہا تھا لستری کہے جا رہی تھیں میری آنکھوں کی نمی لکیریں بن کر بہنے لگی تھیں اور بمشکل میں ایسے جذبات کو باندھ کر اتنا ہی کہہ سکا تھا ـــــ ' اسے بھائی کو اتنا پیار اور مان آپ نے دیا کہ اس دولت سے میں مالا مال ہو گیا ہوں ـــــ آپ کی اور تمام دوستوں کی بدولت یہاں مجھے ایک پہچان ملی ہے، بے پناہ عزت اور پیار ملا ہے، ایسا ایک گھر ملا ہے ـــــ اور سب سے بڑھ کر اپنے جنم کی اس دھرتی سے میرے وجود کا رشتہ اور بھی گہرا ہوا ہے ـــــ اور انسانی رشتوں کا وہ احساس ملا ہے جو انسان سے انسان کو محبت کے بندھن میں باندھتا ہے جس کی کوئی سرحد نہیں ہوتی اور جس کا کوئی رنگ، نام اور مذہب نہیں ہوتا ـــــ آدمی اور آدمی کے درمیان جو صرف محبت کا رشتہ ہوتا ہے ـــــ ۱" لستری گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہونے لگیں تو میری طرح اُن کی آنکھوں میں بھی برسات کے موتی چمک رہے تھے اپنوں سے جُدا ہونے کے لمحوں کا درد کس قدر شدید ہوتا ہے اس کا ایسا احساس مجھے پہلی بار ہوا تھا اور ضیا تسنیمی کے ان اشعار کے الفاظ میرے دل کی دھڑکنوں کی طرح دھڑکنے لگے تھے ـــــ

کہا تھا کس نے گلے مل کے بھیگی پلکوں سے ۔۔۔ میں تیرا پیار ہوں مجھ کو سنبھال کر رکھنا
رہے کہ پلٹ کے آؤں گنگناتا ہوا ۱ ۔۔۔ اسی طرح سے کھلا اپنے گھر کا در رکھنا

گھر سے روانگی کے وقت بھائی رحمٰن مجھ سے بغل گیر ہو گئے اور چند لمحے ہم ایک دوسرے کی باہوں میں جکڑے یوں رکے رہے کہ جیسے دل کی دھڑکنیں ایک دوسرے سے مخاطب ہوں میاں عبدالرحمٰن صاحب کی لاجواب اور پائیدار شخصیت کو زندگی میں شاید کبھی بھی میں بھول نہ سکوں گا۔

لاہور شہر کے وسط میں بہتی ندی کے کنارے کنارے گاڑی ایک بار پھر دوڑ رہی تھی مرے پیارے دوست مقبول احمد دہلوی لاہور سے واہگہ تک کا سفر مرے ساتھ کر رہے تھے۔ ایک پیکٹ دھیرے سے انھوں نے مرے بیگ میں ڈال دیا تھا میں نہیں جانتا کہ اس پیکٹ کے اندر کیا تھا لیکن اُن چیاں کاغذ پر لکھی تحریر کو مری آنکھیں پڑھ رہی تھیں — " .. محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی آمد اور روانگی کے درمیاں محض چند لمحے تھے جنھیں سمیٹ کر اب آپ جا رہے ہیں اور ساتھ ہی جیسے ساری رونق جا رہی ہے — بہت محبت کے ساتھ پاکستان آپ کو وداع کہتا ہے — اس امید کے ساتھ کہ محبتیں لیے پھر آپ یہاں آئیں گے " اور اچانک ہی کرشن ادیب کے یہ شعر مجھے یاد آ گئے تھے —

سوچتا ہوں کب ملیں گے آج سے بچھڑے ہوئے
بس یہی اک سوچ تس نے اور بہا کر دیا

دل کا دروازہ کھُلا رکھا تو مرے واسطے
تجھ سے ملنے ترا دوست اک دل تو آئے گا

سیالکوٹ سڑک پر نہر کے کنارے کنارے دوڑتی ہوئی ہماری گاڑی اونچے اونچے درختوں گھاس کے مخملی قالینوں اور آسماں کو چھوتی بڑی بڑی عمارتوں کو پیچھے چھوڑتی بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی وہی راستہ تھا، رستے پر لیے وہی گاؤں تھے اور جب واہگہ سرحد کے اِس طرف گاڑی رُکی تو پندرہ روز قبل جیسی ہی گہما گہمی تھی لیکن ایسا کچھ تھا جو چند یوں اور دھڑکنوں میں پُلپلوں کی مانند احساس دلا رہا تھا کہ میں یہاں نہیں ہوں — تمہارا ہم سفر نہیں ہوں — میں تو پیچھے بہت پیچھے رہ گیا ہوں ایسا کچھ ہونے کا احساس تشنگی، کسک اور محبت کا احساس تھا۔

کئی قُلی مرا ساماں اٹھائے پاکستانی چیک پوسٹ سے بھارتی چیک پوسٹ کی طرف بڑھ رہے تھے اُن کے پیچھے میں تھا، مقبول دہلوی اور ورید محمد تھے۔ قدم اچانک رُک گئے میں نے دیکھا مرا

ایک قدم زمین کے اُس ٹکڑے پر تھا جو پاکستان کی دھرتی تھی دوسرا قدم اُس دھرتی پر تھا جو آزاد زمین کا ٹکڑا تھی اور میری آنکھیں فرلانگ بھر کے فاصلے پر سامنے بھارت کی دھرتی کو دیکھ رہی تھیں مقبول دہلوی مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔ وہ پیر محمد کو سینے سے لگا کر مقبول دہلوی سے میں نے کہا۔

—— تمام دوستوں کو میرا سلام کہنا جن سے مل نہیں سکا، میری طرف سے ان سبھی سے معافی مانگ لینا۔ ان سے کہنا کہ میں اپنا دامن ان کی محبتوں اور پیار بھرے رشتوں سے بھر کر ایک گھر سے دوسرے گھر لوٹ رہا ہوں یہ محبتیں دھڑکنیں بن کر میرے دل میں مچلتی رہیں گی —— مجھے اُن کے بے پناہ خلوص اور خوبصورت دوستیوں کی ہمیشہ یاد دلاتی رہیں گی —— دعا کرنا کہ ہماری محبتوں اور دوستیوں کا رشتہ مزید استوار ہو —— یہ بھی دعا کرنا کہ خدا ہمیں امن و آشتی کے کھلے ماحول میں سانس لینے کی توفیق بخشے —— "

آگے بڑھ کر دوسرا قدم پہلے قدم سے آملا تھا اور ایک بار پھر میں بھارت اور پاکستان کی سرحدوں کے درمیان اُس آزاد زمین کے ٹکڑے پر کھڑا تھا جس کی ہواؤں میں مہک تھی —— جس کی ہریالیوں میں زندگی کے رنگوں کی آمیزش تھی —— اور جس کے ماحول میں وہ خوشبو تھی جو میرے سفر میں رچ بس کر میرے وجود میں سما گئی تھی



چند قابلِ مطالعہ کتابیں

کتاب	صنف	مصنف	قیمت
اردو کہانیاں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو	(تحقیق)	ڈاکٹر یونس اگاسکر	80/
غزل کے نئے جہات	(تنقید)	ڈاکٹر سید محمد عقیل	70/-
انتخاب کلیاتِ جوش		ڈاکٹر فضل امام	60/-
پریم چند۔ کچھ نئے مباحث	(تنقید)	مانک ٹالا	70/-
مرتنی صاحب کے خطوط	(مراسلے)	مرتبہ ملکہ جیلانی	70/-
انیس شخصیت اور فن		ڈاکٹر فضل امام	50/-
میراجی شخصیت اور فن		کمار پاشی	40/-
ن م راشد شخصیت اور فن		ڈاکٹر شہریار	40/
گوپال متل شخصیت اور فن		کمار پاشی	50/
حرفِ راز: اقبال کا مطالعہ		ڈاکٹر حامدی کاشمیری	25/-
تنقیدی ابعاد	(تنقید)	ڈاکٹر مظفر حنفی	70/-
اردو ناول اور تقسیمِ ہند	(تحریر)	عقیل احمد	40/
نئی تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر عبدالستار دلوی	50/-
تخلیق و تنقید	(تنقید)	ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین	40/-
عزیز احمد کی ناول نگاری	(")	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	30/-
طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ	(تنقید)	خواجہ عبدالغفور	50/-
اردو شاعری میں اشاریت	"	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	45/-
اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقا	"	ڈاکٹر روشن اختر کاظمی	50/-
ادب کی پرکھ	"	ڈاکٹر مرلش	30/-
متن و تعبیر	(تنقید)	ڈاکٹر مسیح اعظمی	36/-
تے پیارے لوگو	(تنقید)	ڈاکٹر وارث علوی	40/-
سبے حال میں	(تنقید)	پروفیسر نظیر صدیقی	[illegible]8/-
مضامینِ ڈاکٹر عبدالودود	"	مرتبہ: صفیہ ودود	30/-
ڈاکٹر مظفر حنفی حیات شخصیت اور کارنامے	"	ڈاکٹر محبوب راہی	25/-

موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲ -- 11